ربیع الاول ۱۳۸۶ھ عدد ۱

ماہنامہ

میثاق

لاہور

★

زیر سر پرستی

مولانا امین احسن اصلاحی

★

مدیر مسئول

اسرار احمد

★

یکے از مطبوعات

دار الاشاعت الاسلامیہ

بالمقابل ڈاکخانہ ۔ کرشن نگر ۔ لاہور

قیمت فی پرچہ ساٹھ پیسے
سالانہ: چھ روپے (پندرہ شلنگ)

علوم قرآنی کا بیش بہا خزانہ

مولانا امین احسن اصلاحی صاحب

کی تفسیر

تدبرِ قرآن

جلد اول

جو تفسیر آیہ بسم‌اللہ ، تفسیر سورہ فاتحہ ، تفسیر سورہ
اور تفسیر سورہ 'ال عمران کے علاوہ ایک جامع
مقدمے اور ایک مکمل فہرست پر مشتمل
ہو گی ۔

ــ انشاء اللہ عنقریب شائع ہو گی ــ

مفصل اعلان کا انتظار فرمائیں

دارُالاشاعتِ الاسلامیہ

بالمقابل ڈاکخانہ ۔ کرشن نگر ۔ لاہور

"میثاق"

(تحریر: ———— مولانا امین احسن اصلاحی)

ماخوذ از "تذکرہ وتبصرہ" میثاق جون ۵۹ء

اس رسالے کا نام "میثاق" محض اتفاق سے نہیں رکھ لیا گیا ہے۔ بلکہ یہ نام سوچ سمجھ کر انتخاب کیا گیا ہے۔ یہ نام بہت بڑی حد تک اس مقصد کو تعبیر کرتا ہے جو اس کے نکالنے سے پیش نظر ہے۔

لغت میں میثاق سے مراد وہ عہد و پیمان ہوا کرتا ہے جو شعور اور ارادے کے ساتھ پورا کرنے کیلئے باندھا جائے۔ قرآن و حدیث میں اس کا مفہوم اس سے بہت بلند ہے اور چونکہ وہی مفہوم اس نام میں ہمارے پیش نظر ہے اس وجہ سے اس کو سمجھ لینا ضروری ہے۔

قرآن مجید میں اس سے مراد وہ عہد و پیمان ہے جو خدا اور اس کے بندوں کے درمیان ہوا ہے قرآن نے اس قسم کے دو میثاقوں کا ذکر کیا ہے۔ ایک تو وہ میثاق ہے جو اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کو اس دنیا میں بھیجنے سے پہلے ان کی عقل و فطرت سے لیا ہے۔ اس میثاق کا ذکر سورہ اعراف میں اس طرح فرمایا ہے۔

واذ اخذ ربك من بنی آدم من ظهورهم ذريتهم واشهدهم على انفسهم الست بربكم قالوا بلى شهدنا ان تقولوا يوم القيامة انا كنا عن هذا غافلين ۱۷۲ - "اعراف"	اور یاد کرو جبکہ نکالا تمہارے رب نے بنی آدم سے یعنی انکی پیٹھوں سے ان کی ذریت کو اور انکو خود انکے اوپر گواہ بنایا، پوچھا کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں انہوں نے اقرار کیا کہ ہم گواہ ہیں کہ تو ہمارا رب ہے یہ اس لئے ہوا تاکہ تم قیامت کے دن یہ نہ کہہ سکو کہ ہم تو اس چیز سے بالکل بے خبر ہی رہے۔

یہ خدا کی ربوبیت اور اس کی توحید کا میثاق ہے جو ہر انسان کی فطرت سے لیا گیا ہے اور اس پر ہماری عقل و فطرت گواہ ہے۔

دوسرا عہد و میثاق وہ ہے ــــــــ جو اسی میثاق فطرت کی بنیاد اور درحقیقت اسی کے تقاضوں اور مطالبات کو بروئے کار لانے کے لئے ہمارے رب نے اپنے نبیوں اور رسولوں کی وساطت سے ہم سے لیا ہے ۔ یہ میثاق حضرت آدم سے لے کر حضرت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تک جتنے پیغمبر اور رسول آئے ہیں سب نے خدا کے نمائندے کی حیثیت سے اپنی اپنی امتوں سے لیا ہے ۔ یہ میثاق اپنی فطرت کے لحاظ سے ہے ایک ہی میثاق لیکن چونکہ اس کی تجدید بار بار اور مختلف زمانوں میں ہوئی ہے اس وجہ سے ظاہر ہیں اس کے اندر تعدد پیدا ہو گیا ہے ۔ قرآن مجید نے ان تمام میثاقوں کا حوالہ دیا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا ہے کہ یہ میثاق اب امت محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) سے لیا جا رہا ہے تو اس امت کے لوگوں کا فرض ہے کہ اس میثاق پر خود بھی قائم رہیں اور دوسروں کو بھی اس کے اندر شامل کرنے اور ان کو اس پر قائم رکھنے کے لئے برابر اس کی شہادت دیتے رہیں ۔ قرآن جو اس میثاق کی آخری اور مکمل دستاویز ہے ، اس حقیقت کی یاد دہانی ان الفاظ میں کر رہا ہے ۔

واذکروا نعمۃ اللہ علیکم ومیثاقہ الذی واثقکم بہ ، اذ قلتم سمعنا واطعنا واتقوا اللہ ان اللہ علیم بذات الصدور ٥ (۷ ۔ مائدہ)	اور تم اس فضل کو یاد رکھو جو اللہ نے تم پر فرمایا اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا ۔ جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور قبول کیا اور اللہ سے ڈرتے رہو ، بے شک اللہ دلوں کے بھیدوں کو جاننے والا ہے ۔

ایک جگہ فرمایا ہے ۔

وقد اخذ میثاقکم ان کنتم مومنین (۸ ۔ حدید)	اور اللہ نے تم سے میثاق لیا ہے اگر تم مومن ہو ۔

یہی میثاق ہے جو ان تمام حقوق و فرائض کو متعین کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے لئے ہم نے تسلیم کئے ہیں ۔ یہی میثاق ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ اس دنیا میں ہمارے حدود کار کیا ہیں اور اگر ہم ان کے پابند رہیں تو اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ کیا معاملہ کرے گا اور اگر ہم ان کی خلاف ورزی کریں تو اس جرم کی سزا کیا دے گا ۔ یہ عہد و میثاق یکطرفہ نہیں ہے بلکہ ، جیسا کہ ہر عہد و میثاق کی فطرت ہوتی ہے

یہ دو طرفہ ہے۔ اگرچہ تمام کائنات کے خالق و مالک کی شان اس سے ارفع ہے کہ وہ اپنے بندوں اور غلاموں پر اگر کچھ حقوق و فرائض عاید کرے تو اس کے جواب میں خود اپنے اوپر بھی ان کے حقوق عاید کرے اور اس چیز کو ایک معاہدہ اور میثاق کا درجہ دے دے لیکن چونکہ اس نے ہمیں اختیار کی نعمت عطا فرمائی ہے اس وجہ سے اس نے اس عہد و میثاق کو ہمارے اوپر یک طرفہ واجب نہیں کیا ہے بلکہ اپنے فضل و رحمت سے خود اپنے اوپر بھی اس میثاق کی ذمہ داری لی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں صاف الفاظ میں ارشاد فرمایا ہے۔

اوفوا بعھدی اوف بعھدکم وایای فارھبون۔ (۴۰۔ بقرہ)	تم اس عہد کو پورا کرو جو تم نے مجھ سے کیا ہے میں اس عہد کو پورا کروں گا جو میں نے تم سے کیا ہے تو تم مجھ ہی سے ڈرو۔

اسی میثاق پر ہمارے رب کے ساتھ ہمارے تمام تعلقات قائم ہیں۔ اگر ہم اس پر قائم رہیں تو ہم اپنے رب کی وفادار رعیت اور اس کے اطاعت شعار غلام ہیں اور اس کی طرف سے ہمارے لئے فوز و فلاح اور غلبہ و نصرت کا وعدہ ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے۔

ومن اوفی بما عاھد علیہ اللہ فسیوتیہ اجرا عظیما (۱۰۔ الفتح)	اور جو ان باتوں کو پورا کرے گا جن کے لئے اُس نے اللہ سے عہد کیا ہے تو اللہ اس کو اجر عظیم عطا فرمائے گا۔

اور اگر ہم اس عہد کو توڑ دیں تو ہم اس کے نافرمان اور باغی ہیں اور اس جرم کی پاداش میں اس کی طرف سے ہمارے لئے لعنت اور دنیا و آخرت دونوں کی رسوائی ہے، ارشاد ہے۔

والذین ینقضون عھد اللہ من بعد میثاقہ ویقطعون ما امر اللہ بہ ان یوصل ویفسدون فی الارض اولئک لھم اللعنۃ ولھم سوء الدار۔ (۲۵۔ الرعد)	اور جو لوگ اللہ کے عہد کو مضبوطی کے ساتھ باندھ چکنے کے بعد توڑتے ہیں اور اس چیز کو کاٹتے ہیں جس کو اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں اُن کیلئے لعنت اور بُرا ٹھکانا ہے۔

یہود کے بارے میں فرمایا ہے۔

فبما نقضهم ميثاقهم لعنّاهم وجعلنا قلوبهم قاسية (۱۳ - مائدہ)

بوجہ اس کہ انہوں نے میثاق کو توڑا ہم نے ان کے اوپر لعنت کر دی اور ان کے دل سخت کر دیئے

نصاریٰ کے بارے میں فرمایا ہے۔

ومن الذين قالوا انا نصارى اخذنا ميثاقهم فنسوا حظا مما ذكروا به فاغرينا بينهم العداوة والبغضاء الى يوم القيمة (۱۴ - مائدہ)

ان لوگوں سے جنہوں نے کہا ہم نصاریٰ ہیں ہم نے ان کا میثاق لیا تو جس چیز کے ذریعہ سے ان کو یاد دہانی کی گئی تھی اس کا ایک حصہ وہ بھلا بیٹھے تو ہم نے ان کے اندر اس کی پاداش میں قیامت تک کے لئے دشمنی اور نفرت کی آگ بھڑکا دی۔

یہ رسالہ اسی میثاق کی تذکیر و یاد دہانی کے لئے جاری کیا گیا ہے، اور اسی نسبت سے اس کا نام میثاق رکھا گیا ہے۔ جس طرح ہر باوفا اور ہر صداقت شعار کے لئے اس میثاق پر ہر طرح کے حالات کے اندر قائم رہنا ضروری ہے اسی طرح ہر صاحب علم اور ہر صاحب شعور کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ دوسروں کو اس عہد و پیمان کی یاد دہانی بھی کرتا رہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں سے اس میثاق پر قائم رہنے کا بھی عہد لیا ہے اور ساتھ ہی دوسروں کو اس سے آگاہ کرنے اور ان پر اس کی حجت تمام کرنے کا بھی عہد لیا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے

واذ اخذنا من النبيين ميثاقهم و منك ومن نوح وابراهيم وموسى و عيسى بن مريم واخذنا منهم ميثاقا غليظا (۷ - احزاب)

اور یاد کرو، جبکہ ہم نے نبیوں سے میثاق لیا، اور تم سے اور نوح سے، ابراہیم سے، موسیٰ سے اور عیسیٰ بن مریم سے سب سے میثاق لیا اور لیا ہم نے ان سے مضبوط میثاق۔

اسی طرح اہل کتاب کے علماء اور پیشواؤں سے یہ عہد لیا گیا کہ جس کتاب اور شریعت کی پابندی کا انہوں نے اقرار کیا ہے اس پر پوری مضبوطی کے ساتھ خود بھی قائم رہیں اور اس کی دفعات اور اس کے مضمرات دوسروں پر بھی آشکارا کرتے رہیں۔ فرمایا ہے۔

واذ اخذ اللہ میثاق الذین اوتوا الکتاب لتبیننہ للناس (۱۸۷- آل عمران)

اور یاد کرو جبکہ اللہ نے اہل کتاب سے اس بات کا میثاق لیا کہ تم اس کو اچھی طرح لوگوں کے لئے واضح کرتے رہو گے۔

یہ رسالہ اس فرض عظیم کو بلا امتیاز مذہب عام انسانوں کے اندر بھی ادا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اور خاص طور پر مسلمانوں کے اندر بھی اس کو ادا کرنا چاہتا ہے اور ان دونوں دائروں کے اندر ان کے فطری تقاضوں کے لحاظ سے اس کا طریق تذکیر و دعوت کسی قدر الگ الگ ہوگا۔

عام بنی نوع انسان کو یہ خدا کے میثاق ربوبیت کی بنیاد پر دعوت دیگا۔ اس میثاق کے اوپر گواہ جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ہے انسان کی عقل و فطرت ہے اس وجہ سے عقل و فطرت اور آفاق و انفس کے اندر اس کی جو شہادتیں موجود ہیں ان کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی جائیگی اور پھر زندگی کے اندر اس کے جو تقاضے ابھرتے چاہئیں ان کی نشان دہی کی جائے گی۔ جدید فلسفہ نے فکر و تحقیق کے ہر گوشے میں اگر ایک طرف حقیقت کو گم کر دینے والی بہت سی مزخرفات کا انبار لگا رکھا ہے تو دوسری طرف اس میں ایسے نشانات راہ بھی پائے جاتے ہیں جن کی مدد سے اس کی پیدا کی ہوئی بہت سی الجھنوں کو دور بھی کیا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ ان کو اچھی طرح اجاگر کیا جا سکے اور قرآنی حکمت کی کسوٹی پر ان کو پرکھا جا سکے۔ اس مقصد کے تحت اس رسالے میں جو مضامین شائع ہونگے انشاء اللہ وہ ان ذہنوں کے لئے تریاق کا کام دیں گے جو جدید فکر و فلسفہ سے متاثر یا مسموم ہیں اور جو ہر بات کو صرف عقل کی میزان میں تولنا چاہتے ہیں۔

خاص مسلمانوں کے لئے اس رسالے کی دعوت یا ایہا الذین آمنوا اوفوا بالعقود (۱- مائدہ) کی دعوت ہے یعنی اللہ تعالے کے آخری رسول کے واسطہ سے ہم نے اس کی جس آخری شریعت کی اطاعت اور پابندی کا عہد کیا ہے ہم میں سے ہر ایک کا فرض ہے کہ پوری وفاداری کے ساتھ اس شریعت کی پابندی کرے۔ یہ شریعت ہمارے اور ہمارے رب کے درمیان ایک میثاق کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہم سمعنا واطعنا کہہ کر اس میثاق میں شامل ہوئے ہیں اور ہماری بندگی اور وفاشعاری کا تقاضا یہ ہے

ـــــ کہ اس میثاق کے مطالبات پوری ایمان داری کے ساتھ ادا کریں۔ یہی میثاق درحقیقت وہ حبل اللہ ہے جو ہمیں خدا کے ساتھ جوڑتی اور ہمیں دنیا و آخرت میں ان نعمتوں کا حقدار بناتی ہے جن کا خدا کی طرف سے وعدہ کیا گیا ہے۔ اگر یہ حبل اللہ ٹوٹ جائے تو پھر خدا سے ہمارا تعلق ہی سرے سے ٹوٹ جاتا ہے۔ اس کے بعد اگر ہمیں قومی اور اجتماعی حیثیت سے جینے کی کوئی مہلت ملتی ہے تو اس کی حیثیت بس ایک مہلت کی ہے۔ یہ مہلت اس لئے نہیں ملتی کہ ہم عزت کے ساتھ جینے کے حقدار ہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی مقررہ سنت کے تحت محض اس لئے ملتی ہے کہ ڈوبنے کے لئے ہماری کشتی اچھی طرح بھر جائے۔ اس مہلت کے دوران میں اگر زندگی کے کسی گوشے میں چمک دمک کے کچھ آثار بھی نظر آئیں تو اس سے بھی کسی دھوکے میں نہیں پڑنا چاہیئے۔ اس کی مثال مریض کے اس سنبھالے کی سی ہے جو وہ دم توڑنے سے پہلے لیا کرتا ہے۔

ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ وسوسہ پیدا ہو ـــــ کہ سمعنا و اطعنا کا اقرار کر کے خدا سے کوئی عہد و میثاق باندھا ہے تو ان لوگوں نے باندھا ہے جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود تھے۔ اس عہد و میثاق کی ذمہ داری ان لوگوں پر کس طرح عاید ہوتی ہے جو بعد کے زمانوں میں پیدا ہوئے؟ اس وسوسے سے اپنے ذہن کو پاک رکھنے کے لئے یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ جب تک ہم اللہ کو اپنا رب، قرآن مجید کو اس کا صحیفۂ آسمانی، محمد رسول اللہ ؐ کو اپنا واجب الاطاعت ہادی اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو اس امت کا ہراول دستہ مانتے ہیں اس وقت تک ہم اس سمعنا و اطعنا کی ذمہ داری سے انکار کرنے کا حق نہیں رکھتے جس کا اقرار صحابہ رضی اللہ عنہم نے کیا۔ اس اقرار کی ذمہ داری صحابہ ؓ نے اپنے بعد آنے والی نسلوں کی طرف منتقل کی اور پھر ان سے یہ ذمہ داری درجہ بدرجہ بعد کی نسلوں کی طرف منتقل ہوتی رہی۔ ہر عہد کے اخیار و صالحین نے اس ذمہ داری کو اپنے اسلاف کا سب سے زیادہ مقدس ورثہ سمجھا۔ اور اس ذمہ داری کو اٹھانے کے لئے جو اقرار صالح اگلوں نے کیا تھا پچھلوں نے بھی اس کو اپنا اقرار صالح تسلیم کیا۔ اس لئے کہ اس اقرار کا انکار یا اس سے گریز و فرار ان کے لئے اس وقت تک ممکن ہی نہ تھا جب تک وہ اپنے ان اسلاف سے خدانخواستہ برأت کا اور اسلام سے اپنے قطع تعلق کا اعلان نہ کر دیں۔

ہم اگر ان مقدس اسلاف ہی کے خلف ہیں اور اپنے اس ماضی سے بیزار نہیں ہو گئے ہیں۔ تو

سمع وطاعت کا جو اقرار ہمارے اسلاف نے کیا ہے وہ خود ہمارا بھی اقرار ہے اور ہم اپنی ناخلفی کا اعلان کئے بغیر اس اقرار کی ذمہ داریوں سے انکار نہیں کر سکتے۔ اگرچہ یہ ایک بالکل کھلی ہوئی حقیقت ہے جس کو کوئی مسلمان جھٹلانے کی جرأت نہیں کر سکتا لیکن اس کے ساتھ ہی مندرجہ ذیل حقیقتوں سے بھی کوئی صاحبِ نظر انکار نہیں کر سکتا۔

ہم میں بہت سارے لوگ ایسے ہیں جو سرے سے اس بات سے واقف ہی نہیں ہیں کہ ہمارے رب کے ساتھ ہمارا تعلق کسی میثاق کے تحت ہے اور اس میثاق کی ہر چیز لکھی ہوئی اور متعین ہے اور ہم نے سمعنا واطعنا کے اقرار کے ساتھ اس کی تصدیق کی ہے۔ ان لوگوں کا تعلق خدا کے ساتھ محض رسمی اور رواجی ہے اور اگر وہ کسی حد تک اس کو نباہتے ہیں تو اسی حیثیت سے اس کو نباہتے ہیں نہ اس کے اندر کوئی زندگی ہے نہ کوئی اثر۔

ہم میں بہت سے ایسے لوگ بھی ہیں جو اس معاہدے کی بہت سی دفعات سے متعلق مختلف قسم کے شکوک وشبہات میں مبتلا ہیں۔ ان میں سے بعض اپنے شبہات وشکوک کو برملا ظاہر بھی کرتے ہیں۔ بعض ان کو ظاہر تو نہیں کرتے لیکن ان کو اپنے دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں جس کے سبب سے وہ نفاق اور بے یقینی کے مریض بن کر رہ گئے ہیں۔

بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو اس میثاق کی دفعات میں سے صرف انہی دفعات کو ماننا چاہتے ہیں جو ان کی خواہشوں کے مطابق ہیں۔ ان دفعات کو یہ نظر انداز کر دینا چاہتے ہیں جو ان کی خواہشات کے خلاف ہیں۔ یہ ترک و اختیار وہ من مانے طور پر یک طرفہ کر رہے ہیں۔ حالانکہ یہ ایک معاہدہ ہے۔ جو ان کے اور ان کے رب کے درمیان ہوا ہے جس میں کوئی ادنیٰ تغیر و تبدل بھی وہ خدا کی مرضی کے بغیر کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔ انہوں نے اس رد و قبول کے لیے کسوٹی تہذیب حاضر کو قرار دیا ہے جو چیز اس کسوٹی پر پوری اتر جائے وہ سر آنکھوں پر اور جو چیز اس پر پوری نہ اتر سکے وہ ناقابل التفات۔

بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو مختلف قسم کی طفلانہ تاویلوں سے اس پورے میثاق کو ایک بازیچۂ اطفال بنائے دے رہے ہیں اور اس کی ہر دفعہ کی ایسی ایسی تاویلیں کر رہے ہیں جن سے صاف واضح ہوتا ہے کہ ان کے پیشِ نظر مقصد تو درحقیقت پورے میثاق کا انکار ہے لیکن کھلم کھلا

انکار کے بجائے انہوں نے تاویل باطل کی راہ اختیار کی ہے۔

بعض لوگوں نے سرے سے اس ذات ہی کو مجروح کرنا شروع کر دیا ہے جو اس میثاق کا اصل واسطہ ہے اور جس نے خدا کے نمائندے کی حیثیت سے ہم سے یہ میثاق لیا ہے۔ ان لوگوں کے نزدیک اس میثاق کا وہ سارا ریکارڈ مشتبہ ہے جو اس ذات کے قول و فعل سے متعلق ہے۔

بعض لوگوں نے حکمت عملی یا عملی سیاست کے نام سے اس میثاق کی قطع و برید کے لئے دین میں ایک نئے اصول ردّ و قبول کا اضافہ کیا ہے۔ ان کے نزدیک عملی سیاست کے تقاضوں کے تحت اس میثاق کی ہر دفعہ کالعدم کی جا سکتی ہے۔

یہ رسالہ مذکورہ بالا سارے گروہوں کی غلطیوں اور غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کریگا اور ان شاء اللہ ہر باب میں اس کا انداز بحث علمی اور تحقیقی ہوگا۔ اس میں نقل کے ساتھ ساتھ عقل کو بھی وہ اہمیت دی جائے گی جس کی وہ مستحق ہے تاکہ وہ لوگ بھی ان مباحث سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکیں جو جدید نظریات کے شعبدوں سے متاثر ہیں۔ اس طرح کے لوگ ان شاء اللہ اس رسالہ کے ہر نمبر میں اپنے لئے نہایت روح پرور اور صحت بخش غذا پائیں گے۔ ہمارے کالجوں میں بھی اور دینی مدرسوں میں بھی ایسے بہت سے ذی صلاحیت اور ذہین لوگ موجود ہیں جو خدا کی شریعت کو ان پہلوؤں سے سمجھنا چاہتے ہیں جن پہلوؤں سے موجودہ عہد میں اس کو سمجھنا ضروری ہے۔ لیکن وہ اپنی اس تشنگی کو دور کرنے کا کہیں سامان نہیں پا رہے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ رسالہ کے اس باب کے مضامین ان کے لئے اچھا فکری مواد فراہم کریں گے۔

اب میں دعا کیلئے ہاتھ اٹھاتا ہوں اور اس رسالہ کے تمام قارئین سے اس دعا پر آمین کہنے کی درخواست کرتا ہوں اے رب! تیرے چند عاجز بندوں نے تیرے دین کی ایک حقیر سی خدمت انجام دینے کے لئے یہ کام شروع کیا ہے۔ اے رب تو اس کام کو قبول فرمانے والا، سننے والا اور جاننے والا ہے۔ اے رب ہم تیرے ساتھ اپنے عہد کو تازہ کرنے کا عزم کرتے ہیں تو اس عزم میں ہماری مدد فرما اور اے رب ہمیں تو توفیق دے کہ ہم تیرے دوسرے بندوں کے اندر بھی اس عزم کی گرمی پیدا کر سکیں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ۔

امین احسن اصلاحی

تدبرِ قرآن

تفسیر سورۂ آلِ عمران

(۷)

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تُحَاجُّونَ فِي إِبْرَاهِيمَ وَمَا أُنْزِلَتِ التَّوْرَاةُ وَالْإِنْجِيلُ إِلَّا مِنْ بَعْدِهِ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝ هَا أَنْتُمْ هَٰؤُلَاءِ حَاجَجْتُمْ فِيمَا لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَاجُّونَ فِيمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ ۚ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۝ مَا كَانَ إِبْرَاهِيمُ يَهُودِيًّا وَلَا نَصْرَانِيًّا وَلَٰكِنْ كَانَ حَنِيفًا مُسْلِمًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِإِبْرَاهِيمَ لَلَّذِينَ اتَّبَعُوهُ وَهَٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِينَ آمَنُوا ۗ وَاللَّهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِينَ ۝

ان آیات میں کوئی نحوی یا ادبی اشکال نہیں ہے، مضمون بھی ان کا پوری تفصیل کے ساتھ سورہ بقرہ کی تفسیر میں بیان ہو چکا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام چونکہ بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل دونوں ہی کے مسلّم خاندانی و روحانی پیشوا تھے اس وجہ سے یہود، نصاریٰ اور مشرکین تینوں ہی گروہ اپنی اپنی بدعات کی حمایت میں ان کے نام کو استعمال کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ یہود کہتے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہمارے طریقہ پر تھے، نصاریٰ ان کو اپنے طریقہ پر بتاتے اور مشرکین عرب اپنے طریقہ پر۔ یوں تو یہ ادّعائے فخر ان میں سے ہر گروہ کو ایک دوسرے کے مقابل میں ہمیشہ رہا لیکن اسلام کی دعوت شروع ہونے کے بعد اس کی مخالفت میں خاص حربہ جو ان تینوں ہی گروہوں نے استعمال کیا وہ یہی تھا کہ نیا دین دین ابراہیمی کے خلاف ہے، اصل دین ابراہیمی کے حامل ہم ہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)

ہم کو ہمارے اصلی جدّی دین سے ہٹا کر گمراہ کرنا چاہتے ہیں۔

قرآن نے یہاں ان کے اس پروپگنڈے کی تردید کی ہے کہ تورات اور انجیل کا نزول تو حضرت ابراہیمؑ کے صدیوں بعد ہوا ہے، پھر وہ یہودیت یا نصرانیت پر کس طرح ہوئے؟ بے وقوفی کی بات کے لیے بھی آخر کوئی نہ کوئی چھوٹی موٹی بنیاد ہوا کرتی ہے، تم نے بعض ایسے معاملات میں بھی حجتیں پیدا کی ہیں جن کے بارے میں تمھیں کچھ نہ کچھ علم تھا، ان کے لیے تم کسی جواز کا سہارا لے سکتے ہو اور اپنے آپ کو تسلی دے سکتے ہو لیکن تمہاری یہ بات تو بالکل ہی بادر ہوا ہے، آخر جس چیز کے باب میں تمھیں کچھ معلومات ہی نہیں اس میں دخل در معقولات کے لیے جواز کی کیا گنجائش ہے، حق کی مخالفت و عداوت کا یہ کیسا جنون ہے کہ اتنی موٹی سی بات بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے!

اس کے بعد قرآن نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دین بتایا کہ وہ نہ یہودی تھے نہ نصرانی بلکہ حنیف مسلم تھے۔ "حنیف" کے معنی، جیسا کہ سورہ بقرہ میں وضاحت ہو چکی ہے، یکسو کے ہیں، یعنی وہ توحید کی صراط مستقیم پر تھے۔ انہوں نے اس سے ہٹ کر کج پیچ کی مشرکانہ راہیں نہیں اختیار کی تھیں اور وہ مسلم یعنی اپنے رب کے فرمانبردار تھے۔ اس سے یہ بات نکلی کہ یہودیت اور نصرانیت توحید سے ہٹی ہوئی کج پیچ کی راہیں ہیں جو ہدایت کے بجائے ضلالت کی طرف لے جاتی ہیں۔

اس کے ساتھ ہی اس بات کی بھی وضاحت فرما دی کہ جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہودیت اور نصرانیت سے کوئی تعلق نہیں ہے اسی طرح ان کو مشرکین سے بھی کوئی واسطہ نہیں ہے۔ یہ بات جملے کے عام سیاق سے الگ کر کے اس لیے فرمائی کہ یہ مشرکین بنی اسمٰعیل کی تردید میں ہے جو اس سورہ میں براہ راست مخاطب نہیں ہیں۔ اس سورہ کا خطاب، جیسا کہ اوپر وضاحت ہو چکی ہے، اہل کتاب بالخصوص نصاریٰ سے ہے، مشرکین کی تردید میں اگر اس میں کوئی بات آئی ہے تو وہ ضمناً ہی آئی ہے۔ یہ بات بھی ضمنی باتوں ہی میں سے ہے، اور اس کے ذکر کی ضرورت، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، اس لیے تھی کہ جس طرح یہود و نصاریٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نام کو اپنی گمراہیوں کی تائید میں پیش کرتے تھے اسی طرح بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ زور و شور کے ساتھ قریش کے مشرکین ان کے نام کو اپنی حمایت میں پیش کرتے تھے بلکہ ان کا تو یہ دعوےٰ تھا کہ جس دین پر وہ ہیں یہ دین ان کو حضرت ابراہیمؑ ہی سے وراثت میں ملا ہے۔

اس کے بعد یہ بتایا کہ ابراہیمؑ سے نسبت کے اصل حقدار وہ لوگ ہیں جنھوں نے ان کی پیروی کی ہے۔ یعنی یہ نسبت صرف خاندان اور نسب سے حاصل ہونے والی چیز نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق اتباع اور اطاعت سے ہے۔ اس اعتبار سے حضرت ابراہیمؑ سے سب سے زیادہ اولیٰ و اقرب یہ پیغمبر (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان پر ایمان لانے والے صحابہؓ ہیں، نہ کہ یہود و نصاریٰ اور مشرکین جنھوں نے دینِ ابراہیمی کو بالکل مسخ اور برباد کیا ہے۔

آخر میں فرمایا کہ یہی اہلِ ایمان ہیں جن کا ساتھی اللہ ہے، وہ ان کی مدد فرمائے گا اور ان کے مخالفوں پر ان کو غالب کرے گا اس لیے کہ یہی اس دینِ حق پر ہیں جو حضرت ابراہیمؑ لے کر آئے تھے۔

وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ ۭ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ۝ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

ان میں پہلی آیت کا خطاب مسلمانوں سے بطور تنبیہ ہے کہ یہود اور نصاریٰ یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ کو یہودیت اور نصرانیت کی ان بدعات سے کوئی ادنیٰ تعلق بھی نہیں تھا لیکن اس کے باوجود وہ محض اس لیے یہ پروپگنڈا کر رہے ہیں کہ تمہیں تمہارے دینِ حق سے برگشتہ کریں حالانکہ اس کوشش سے وہ صرف اپنی محرومی اور گمراہی کا سامان کر رہے ہیں۔ جو شخص اپنی گمراہی کو ہدایت ثابت کرنے کے لیے دیدہ و دانستہ دوسرے کو راہِ حق سے ہٹانے کی کوشش کرتا ہے وہ سب سے پہلے خود اپنے ہی کو گمراہی میں مبتلا کرتا ہے۔ لیکن دوسرے کی مخالفت کے جوش میں اس کو اپنی اس حرکت کے اصلی نتیجہ کا احساس نہیں ہوتا۔

بعد کی دو آیتوں میں خطاب اہلِ کتاب سے ہے اور دونوں میں "یا اہل الکتاب" کی تکرار سے حسرت اور ملامت کا اظہار ہو رہا ہے کہ افسوس ہے کہ اہلِ کتاب ہو کر تم نے رہنمائی کے بجائے گمراہ کرنے اور اظہارِ حق کے بجائے کتمانِ حق کا پیشہ اپنے لیے پسند کیا۔

"وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ" کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ آج تم اللہ کی جن آیات کا انکار کر رہے ہو، تمہارے دل ان کے باب میں گواہی دے رہے ہیں کہ یہ اللہ کی آیات ہیں۔ دوسرا یہ کہ آج حسد اور عداوت کے جوش میں تم جس حق کو جھٹلانے کے لیے اپنا ایڑی چوٹی کا زور صرف

کرتا ہے جو اس کی تائید و تصدیق اور خلق کے آگے اس کی شہادت دینے کا تم سے عہد لیا جا چکا ہے اور تم اس ذمہ داری کے اٹھانے کا اقرار کر چکے ہو۔ پہلا مضمون محتاجِ ثبوت نہیں ہے۔ اس دوسرے مطلب کے لیے نظیر اسی سورہ میں آگے موجود ہے۔ فرمایا ہے۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ
النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ
كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ
رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ
بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ
وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ
قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوْا
وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝
(۸۹ - آلِ عمران)

اور یاد کرو جب کہ اللہ نے تم سے نبیوں کے بارے میں میثاق لیا کہ چونکہ میں نے تم کو کتاب و حکمت عطا فرمائی ہے تو جب آئے تمہارے پاس ایک رسول سچّی ثابت کرتا ہوا ان پیشین گوئیوں کو جو تمہارے اپنے پاس موجود ہیں تو تم اس پر ایمان لاؤ گے اور اس کی مدد کرو گے، پوچھا کیا تم نے اس کا اقرار کیا اور اس پر میری طرف سے تم نے ذمہ داری اٹھائی؟ بولے ہم نے اقرار کیا۔ فرمایا تو اس پر گواہ رہنا اور میں بھی تمہارے ساتھ اس کے گواہوں میں سے ہوں۔

اس آیت کی پوری تشریح آگے آ رہی ہے۔

حق اور باطل کو ایک دوسرے کے ساتھ گڈ مڈ کرنے کی وضاحت سورۂ بقرہ کی تفسیر میں اچھی طرح ہو چکی ہے۔ یہود نے یوں تو پوری تورات کو اپنی تحریفات سے مسخ کر ڈالا تھا جس کے سبب سے حق و باطل کا امتیاز مشکل ہو گیا تھا لیکن یہاں خاص طور پر ان کی اُن تحریفات کی طرف اشارہ ہے جو انھوں نے حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسمٰعیلؑ اور تعمیر بیت اللہ سے متعلق حالات و واقعات اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئیوں کے اندر کی تھیں۔ ان تحریفات کا مقصد یہ تھا کہ حضرت ابراہیمؑ کا تعلق مکہ اور بیت اللہ سے اس طرح کاٹ دیا جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق انبیا کے بیان کردہ حقائق پر پردہ ڈالا جا سکے۔ قرآن کے الفاظ وانتم تعلمون سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانۂ نزولِ قرآن کے علمائے یہود بھی ان تحریفات سے واقف تھے اور فی الواقع ان تحریفات کی نوعیت ہی ایسی ہے کہ بادنیٰ تامل ان پر گرفت کی جا سکتی ہے۔ یہ ملحوظ رہے کہ یہاں زیرِ بحث یہود کے عوام کا کردار نہیں بلکہ ان کے علما کا کردار ہے۔ سیاق و سباق اور آیت

کے الفاظ اس پر دلیل ہیں۔

آگے کا مضمون آیات ۷۲ — ۷۶

آگے اہل کتاب، بالخصوص یہود کی بعض سازشوں اور شرارتوں کا ذکر کیا ہے جن کا مقصد یہ تھا کہ کسی طرح وہ مسلمانوں کو ان کے دین سے پھیریں۔ پھر اس گہرے بغض و حسد کا پتہ دیا ہے جو بنی اسرائیل کے اندر بنی اسماعیل کے خلاف تھا جس کے سبب سے وہ کسی طرح بھی اس بات کو گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں تھے کہ بنی اسماعیل بھی ان کی طرح کتاب و شریعت کے حامل سمجھے جائیں اور اللہ کے ہاں ان کے جرائم کے گواہ بنیں۔ گویا اس جوش عداوت میں خدا کے فضل کے اجارہ دار وہ خود بن بیٹھے تھے کہ جس کو چاہیں اس میں سے حصہ دیں اور جس کو چاہیں محروم کر دیں۔

اس عداوت و حسد نے بنی اسماعیل کے خلاف بنی اسرائیل کے مجموعی اخلاق و کردار کو ایک خاص سانچے میں ڈھال دیا تھا وہ ان کے معاملہ میں کسی اخلاقی و شرعی ضابطے کی پابندی کے قائل نہیں تھے۔ ان کی رکھی ہوئی امانتوں میں خیانت کرنا وہ ثواب سمجھتے تھے کہ یہ کافر کا مال ہے، اس کو دبا بیٹھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ قرآن نے ان باتوں کا حوالہ اس لیے دیا کہ مسلمانوں کو متنبہ کرے کہ جن کا حسد اور بغض تمہارے خلاف اس حد تک بڑھا ہوا ہے ان سے یہ توقع نہ رکھو کہ ان کا کوئی مشورہ تمہارے لیے خیر خواہانہ ہو سکتا ہے اور تمہارے حق میں ان کی زبان سے کوئی سچی بات نکل سکتی ہے۔ یہ تو تمہارے ایک پیسے کی بھی چوری کر سکتے ہیں، پھر ان سے یہ توقع کیسے رکھتے ہو کہ یہ تمہاری ایک لاکھ کی امانت ادا کر دیں گے اور تمہارے نبی کے بارے میں اس حق کی شہادت دیں گے جس کے وہ امین بنائے گئے تھے۔ اب اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

وَقَالَتْ طَّائِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝ وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ ۭ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ ۙ اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ اَوْ يُحَاۗجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۭ قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ

وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝ يَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝ وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَاۗىِٕمًا ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَي اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝ بَلٰي مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝

اور اہل کتاب کا ایک گروہ کہتا ہے کہ مسلمانوں پر جو چیز نازل کی گئی ہے اس پر صبح کو ایمان لاؤ اور شام کو اس کا انکار کر دو تاکہ وہ بھی اس سے برگشتہ ہوں اور تم اپنے دین کی پیروی کے سوا اور کسی کی بات کا اعتبار نہ کیا کرو۔ ان سے کہو کہ اصل ہدایت تو اللہ کی ہدایت ہے ــــ کہ مبادا اس طرح کی چیز کسی اور کو بھی مل جائے جس طرح کی چیز تمہیں ملی ہے یا وہ تم سے تمہارے رب کے حضور حجت کر سکیں۔ ان سے کہو کہ فضل تو اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ جس کو چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ بڑی سمائی رکھنے والا اور علم والا ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت کے لیے خاص کر لیتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔ ۷۲-۷۴

اور اہل کتاب میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ اگر ان کے پاس امانت کا ڈھیر بھی رکھو تو مانگنے پر لوٹا دیں گے اور ان میں وہ بھی ہیں کہ اگر تم ان کی امانت میں ایک دینار بھی رکھو تو وہ اس وقت تک اس کو لوٹانے والے نہیں ہیں جب تک تم ان کے سر پر سوار نہ ہو جاؤ۔ یہ اس وجہ سے کہ وہ کہتے ہیں کہ ان امیوں کے معاملے میں ہمارے اوپر کوئی الزام نہیں ہے اور یہ جانتے بوجھتے اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں ــــ ہاں، جو لوگ اس کے عہد کو پورا کریں گے اور اللہ سے ڈریں گے تو بے شک اللہ اپنے سے ڈرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ ۷۵-۷۶

الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی وضاحت

وَقَالَتْ طَّاۗىِٕفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (۷۲) اہل کتاب کی اس سازش کا ذکر کرتے ہوئے قرآن

الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی وضاحت

نے اس بات کی تصریح فرمادی ہے کہ یہ ان کے ایک مخصوص گروہ کی سازش ہے۔ یہ تصریح اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن اپنے مخالفین کے جرائم بیان کرتے ہوئے بھی حق و انصاف کے حدود سے سرمو تجاوز نہیں کرتا۔ اگر ایک جرم مخالف گروہ کی کسی مخصوص پارٹی کا جرم ہے تو وہ اس کی ذمہ داری اسی پارٹی پر ڈالتا ہے، یہ نہیں کرتا کہ چند کی شرارت کی ذمہ داری مخالفت کے جوش میں پوری قوم پر اور ڈھادے۔ یہ انصاف پسندی صداقت کے عام نصب العین سے قطع نظر دعوت حق کے نقطۂ نظر سے بھی نہایت بابرکت اور نتیجہ خیز ثابت ہوتی ہے۔ آگے اس کی بعض نہایت مؤثر مثالیں آرہی ہیں۔

یہاں جس شرارت کا ذکر ہے وہ منافقانہ شرارت کی ایک مخصوص قسم ہے۔ وہ یہ کہ اپنے حریف کے سامنے اپنے آپ کو اس کا دوست اور ساتھی ظاہر کرکے اندر سے اس کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی جائے۔ یہود نے اپنے اس منصوبے کے تحت جو مختلف قسم کی چالیں چلیں، ان میں سے ایک چال یہ بھی تھی کہ ان کے لیڈروں نے اپنے کچھ آدمیوں کو اس بات کے لیے تیار کیا کہ وہ پہلے اپنے ایمان و اسلام کا اظہار و اعلان کرکے مسلمانوں کے اندر شامل ہوں، پھر اسلام کی کچھ خرابیوں کا اظہار کرکے اس سے علیحدگی اختیار کرلیا کریں۔ اس کا فائدہ انھوں نے ایک تو یہ سوچا ہوگا کہ اس طرح بہت سے جدید العہد مسلمانوں کا اعتماد اسلام پر سے متزلزل ہوجائے گا، وہ یہ سوچنے لگیں گے کہ فی الواقع اسلام میں کوئی خرابی ہے جس کے سبب سے یہ پڑھے لکھے لوگ اسلام کے قریب آکر اس سے بدک جاتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ اس تدبیر سے وہ خود اپنی قوم کے عوام کو اسلام کے اثر سے بچالے جائیں گے۔ جب وہ یہ دیکھیں گے کہ ان کی اپنی قوم کے کچھ پڑھے لکھے لوگ اسلام کو آزما کر چھوڑ چکے ہیں تو ان کی وہ رغبت کمزور ہوجائے گی جو اسلام اور مسلمانوں کی کشش کے سبب سے ان کے اندر اسلام میں داخل ہونے کے لیے پیدا ہوئی تھی۔

اس سازش کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ یہود نے جب بھی کسی ملت کو اپنا نشانہ بنایا ہے اس کے لیے تدبیر یہی اختیار کی ہے کہ اس کے اندر گھس کر اس کو مسخ کرنے کی کوشش کی ہے۔ دین مسیحی کو بگاڑنے کے لیے پال نے جو کامیاب کوشش کی وہ مذاہب کی تاریخ کی ایک نہایت درد انگیز داستان ہے۔ پھر مسلمانوں کے عقائد و نظریات کو مسخ کرنے کے لیے یہود و نصاریٰ دونوں نے جو فتنے خود ہمارے

کتب خانوں میں بیٹھ کر اٹھائے ہیں، وہ بھی کوئی مخفی چیز نہیں ہے۔ اگر طوالت کا اندیشہ نہ ہوتا تو ہم یہاں بعض حقائق کی طرف اشارہ کرتے۔

وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ اَوْ يُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝ يَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝

اس آیت کی تشریح و تفسیر میں ہمارے ارباب تاویل کو بڑا اضطراب پیش آیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں اسلوب کی بعض مشکلیں ہیں۔ ہم پہلے ان اسلوبوں کی وضاحت کریں گے اس کے بعد آیت کی صحیح تاویل بیان کریں گے۔

اس میں پہلی سمجھنے کی چیز قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ (کہہ دو کہ اصل ہدایت تو اللہ کی ہدایت ہے) کے ٹکڑے کا جملہ کے اندر مقام ہے۔ یہ ٹکڑا دراصل سلسلہ کلام کا کوئی جزو نہیں ہے بلکہ اس کی حیثیت ایک جملہ معترضہ کی ہے۔ یعنی سلسلہ کلام کے بیچ میں مخاطب کی ایک غلط بات کی برسرموقع تردید فرما دی گئی ہے۔ اصل سلسلۂ کلام یوں ہے کہ وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ الآیۃ۔ یہود جن لوگوں کو سکھا پڑھا کر مذکورہ بالا سازش کے لیے مسلمانوں کے اندر بھیجتے تھے ان کو پورے اہتمام کے ساتھ یہ تاکید بھی کر دیتے تھے کہ مسلمانوں کو ان کے دین سے برگشتہ کرنے کے لیے اسلام کا اظہار تو کر دو لیکن بات بہرحال ماننی اپنے ہی لوگوں کی ہے، اپنے دائرہ سے باہر کسی کی بات ماننا ہمارے لیے جائز نہیں ہے۔ یہ بات چونکہ یہود کی تمام گمراہیوں کی جڑ تھی اس وجہ سے قرآن نے بالکل برسرموقع اس پر ٹوک دیا کہ یہ کیا اندھا بہرا گروہی تعصب ہے جس میں یہ مبتلا ہیں، ان سے کہو کہ اصل ہدایت تو اللہ کی ہدایت ہے جس کی ان کو پیروی کرنی چاہیئے خواہ وہ کسی اسرائیلی پیغمبر کے ذریعہ سے ملے یا کسی اسماعیلی پیغمبر کے واسطہ سے، نجات کے حصول کا ذریعہ تو خدا کی ہدایت کی پیروی ہے نہ کہ یہودیت و نصرانیت۔ یہ بات چونکہ سورۂ بقرہ کی تفسیر میں پوری وضاحت سے بیان ہو چکی ہے، نیز آگے کی سورتوں میں بھی اس کی طرف اشارات آئیں گے اس وجہ سے یہاں اس کے شواہد پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

دوسری چیز اس آیت میں یہ سمجھنے کی ہے کہ "اَنْ" سے پہلے عربی زبان میں بعض اوقات لفظ مخافۃ یا اس کے کوئی ہم معنی لفظ محذوف ہو جاتا ہے۔ اس حذف کی مثالیں کلام عرب میں بھی موجود ہیں اور قرآن میں بھی۔ فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے نظایر اپنی کتاب اسالیب القرآن میں جمع کر دیئے ہیں۔ ہم بھی اپنی اس تفسیر میں جگہ جگہ اس کو واضح کر رہے ہیں۔

اس اسلوب کو ذہن میں رکھنے کے بعد آیت سے مذکورہ بالا جملہ معترضہ کو الگ کر کے اگر اَنْ یُّؤْتٰٓی اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِیْتُمْ اَوْ یُحَآجُّوْکُمْ عِنْدَ رَبِّکُمْ کو وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِیْنَکُمْ کے ٹکڑے سے ملائیے تو معلوم ہوگا کہ یہ درحقیقت ان کے اس باطنی محرک پر روشنی ڈالی جا رہی ہے جس کے تحت وہ اپنے آدمیوں کو بڑے شد و مد کے ساتھ یہ سبق پڑھاتے تھے کہ وہ کسی حال میں بھی کسی غیر اسرائیلی نبی کے دعوے کی صداقت تسلیم نہ کریں۔ یہ باطنی محرک یہ ہے کہ ان کے دل میں یہ چور تھا کہ کہیں اس طرح کی دینی سیادت و پیشوائی نبی اسمٰعیل کو بھی حاصل نہ ہو جائے جس طرح کی سیادت اب تک صرف ان کو حاصل رہی ہے۔ اور ساتھ ہی یہ اندیشہ بھی دل میں تھا کہ اگر ہماری طرف سے کوئی اعتراف اس دین اور اس نبی کے حق میں زبان سے نکل گیا تو مسلمان اس کو قیامت کے دن ہمارے خلاف حجت بنائیں گے کہ ہم نے حق واضح ہونے کے باوجود اس کی تکذیب کی۔ قرآن نے ان کے دل کے اس چور کو ایک دوسرے مقام میں بھی پکڑا ہے جہاں یہ واضح فرمایا ہے کہ یہود اپنے لوگوں کو اس بات کی سخت تاکید کرتے رہتے تھے کہ آخری نبی اور آخری دین کے باب میں تورات کے کسی اشارے کو مسلمانوں پر نہ کھولا جائے ورنہ وہ اس چیز کو قیامت کے روز ان کے خلاف دلیل بنائیں گے۔ چنانچہ بقرہ میں یہ مضمون گزر چکا ہے۔

وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ	اور جب یہ مسلمانوں سے ملتے ہیں تو کہتے
اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَ	ہیں ہم بھی ایمان لائے ہوئے ہیں اور جب آپس
اِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰی	میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں
بَعْضٍ قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ	کہ کیا تم مسلمانوں کو وہ باتیں بتاتے ہو جو اللہ
بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَیْكُمْ	نے تمہارے اوپر کھولی ہیں تاکہ مسلمان ان کی بنا
لِیُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ	پر تمہارے رب کے سامنے تمہیں قائل کریں۔ کیا

رَبِّكُمْ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ اَوَلَا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۝ (۷۶-۷۷ بقرہ)

تم لوگ یہ بات نہیں سمجھتے؟ کیا یہ لوگ یہ نہیں جانتے کہ اللہ ان کی اس بات کو بھی جانتا ہے جو آپس میں رازدارانہ طور پر کہتے ہیں اور اس بات کو بھی جانتا ہے جو وہ مسلمانوں سے علانیہ کہتے ہیں۔

ان دونوں اسلوبوں کے واضح ہو جانے کے بعد اب آیت کا مفہوم بالکل واضح ہے۔ یہود کے علما اور لیڈروں کو مخاطب کر کے کہا جا رہا ہے کہ تم اپنی قوم کے اندر اس تعصب کی آگ بھڑکا رہے ہو کہ کسی اسرائیلی کے لیے کسی غیر اسرائیلی کی نبوت کی تصدیق جائز نہیں، حالانکہ یہ بات محض حماقت اور تنگ نظری پر مبنی ہے۔ اصل شے تو خدا کی ہدایت ہے جس کا تمہیں طالب ہونا چاہیے، خواہ وہ بنی اسرائیل کے کسی شخص پر نازل ہو یا بنی اسماعیل کے۔ تمہارا یہ تعصب حق کی عصبیت و حمیت کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ محض خوف و حسد کا نتیجہ ہے۔ تم ڈرتے ہو کہ مبادا وہ سیادت و پیشوائی جو اب تک صرف تمہیں حاصل رہی ہے کسی دوسرے کو حاصل ہو جائے۔ آیت میں اَحَدٌ کا لفظ ہے لیکن قرینہ دلیل ہے کہ یہاں اس اَحَدٌ کا اشارہ بنی اسماعیل کی طرف ہے جن کے اندر نبی امّی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تھی۔ چونکہ یہاں بنی اسرائیل کے دل کے ایک راز کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے اس وجہ سے قرآن نے اس کو مبہم ہی رکھا ہے۔ اَوْ يُحَآجُّوْكُمْ سے، جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا، ان کے اس اندیشے کی طرف اشارہ ہے کہ اگر آج اسلام اور پیغمبر اسلام کے حق میں ان کے کسی آدمی کی زبان سے کوئی بات نکل گئی تو اس کو قیامت کے دن مسلمان ان کے خلاف حجت بنائیں گے۔

قرآن نے اس پر فرمایا کہ اپنی جس سیادت و پیشوائی کو بچانے کے لیے تم یہ جتن کر رہے ہو، یہ تمہارے اختیار کی بات نہیں ہے، عزت و فضیلت اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہ جس کو چاہے بخشتا ہے اور جس سے چاہے چھینتا ہے۔ اسی نے تم کو یہ عزت بخشی تھی اور اب وہی اگر اس کے لیے کسی دوسرے کو منتخب کر رہا ہے تو تم اس کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتے۔ اس کا فیصلہ نافذ ہو کر رہے گا۔ اَللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و رحمت کو تمہارے تنگ پیمانوں سے ناپ کر نہیں دیتا جن میں تمہارے سوا کسی اور کے لیے کوئی گنجائش ہی نہیں ہے بلکہ وہ بڑی سمائی رکھنے والی ہستی ہے اور

اس کا ہر فیصلہ علم و خبر پر مبنی ہوتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کون کس چیز کا مستحق ہے اور کون مستحق نہیں ہے۔
یَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ الآیہ میں دو باتوں کی طرف اشارہ ہے۔ ایک تو اس بات کی طرف کہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت ایک عظیم اور بے پایاں برکت و رحمت ہے۔ دوسری اس بات کی طرف کہ یہ بنی اسماعیل پر اللہ تعالیٰ کا عظیم انعام ہے کہ اس نے ان کے خاندان کو اس عظیم اور عالم گیر برکت کے ظہور کے لیے منتخب فرمایا۔ اس سے لازمی نتیجہ کے طور پر دو باتیں نکلتی ہیں۔ ایک یہ کہ بنی اسماعیل پر یہ حق ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس عظیم انعام کی قدر کریں اور اس کے شکر گزار رہیں۔ دوسری یہ کہ بنی اسرائیل کے غصہ اور حسد کے علی الرغم اللہ تعالیٰ نے اپنی اس عظیم برکت سے امیوں کو نوازا جس کو چاہے اپنی رحمت کے لیے خاص کرے، اس کی مشیت میں خود اس کی حکمت کے سوا اور کسی کو بھی دخل نہیں ہے۔

وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ۚ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ (۷۵)

"اُمّیّن" سے مراد بنی اسماعیل ہیں۔ اس لفظ پر مفصل بحث ہم سورہ بقرہ کی تفسیر میں کر چکے ہیں۔
"سَبِیْل" کے معنی یہاں الزام اور مواخذہ کے ہیں۔ لَیْسَ عَلَیْنَا فِی الْاُمِّیّٖنَ سَبِیْل یعنی امیوں کے معاملے میں ہم پر کوئی الزام اور مواخذہ نہیں۔

یہ قرآن نے امیین سے متعلق بنی اسرائیل کے ذہن اور ان کے مجموعی کردار کو واضح کیا ہے کہ وہ ان کی امانتوں میں خیانت کرنے اور ان کے مال کو ہڑپ کر جانے میں کوئی قباحت نہیں سمجھتے بلکہ اس کو اپنی دینداری کا حق سمجھتے ہیں۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ تورات میں غصب، خیانت اور سود خواری وغیرہ کی جو ممانعت وارد ہے اس کا تعلق غیر قوموں خصوصاً کافر قوموں سے ہے۔ اپنے اس من گھڑت شرعی فتوے کے تحت انھوں نے دوسری قوموں سے ہر قسم کی بد معاملگی جائز کر لی تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ عرب بنی اسماعیل کو بھی اسی فہرست میں داخل کرتے تھے اس وجہ سے ان کے مال کو بھی خیانت، بد عہدی یا سود وغیرہ کی راہ سے ہڑپ کرنا ان کے نزدیک کوئی قابل اعتراض بات نہیں تھی۔ اہل عرب، یہودی سود خواروں اور مہاجنوں کے پاس اگر کوئی چیز بطور امانت یا رہن رکھتے تو بڑا ہی کوئی قسمت والا ہوتا جو ان کے حلق سے اپنا مال نکالنے میں کامیاب ہوتا ورنہ وہ دبا بیٹھتے اور اپنے اس فعل کو ثواب ثابت کرنے

کے لیے انھوں نے اپنے مولویوں سے فتوے بھی حاصل کر رکھے تھے کہ کافروں کا مال ہڑپ کر جانے میں کوئی عیب نہیں ہے۔

قرآن نے ان کا یہ کردار یہ نمایاں کرنے کے لیے واضح کیا ہے کہ جو تمہاری چند روپوں کی امانت واپس کرنے میں یہ لیت ولعل کرتے ہیں اور اس کے لیے انھوں نے اس اہتمام سے شرعی حیلے ایجاد کر رکھے ہیں ان سے یہ توقع نہ رکھو کہ تمہارے نبی اور تمہارے مذہب و شریعت کے بارے میں یہ پچھلے نبیوں کی جن پیشین گوئیوں کے امین بنائے گئے تھے ان کو وہ آسانی سے ادا کر دیں گے اور خلق کے سامنے ان کی شہادت دینے کی ذمہ داری اٹھائیں گے۔ جو لوگ دنیا کی نہایت حقیر چیزوں میں خائن ہیں وہ اتنی بڑی امانت ادا کرنے کے لیے دل گردہ کہاں سے لائیں گے!

لیکن یہود جیسی ذلیل قوم کے اس کردار کو بیان کرتے ہوئے بھی قرآن نے انصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا، بلکہ ان میں جو اچھے کردار کے لوگ تھے ان کے کردار کی اچھائی کی داد دی بلکہ پہلے انہی کا ذکر کیا تاکہ ان کی حوصلہ افزائی ہو اور وہ اس میدان میں اور آگے بڑھنے کی کوشش کریں۔ یہی لوگ تھے جو بعد میں اسلام کی نعمت سے بہرہ ور ہوئے۔

وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ، یہ ان کے اس من گھڑت اور خانہ ساز فتوے کی تردید ہے جس کا ذکر اوپر ہوا کہ امیوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں وہ اخلاق و شریعت کی پابندیوں سے بری ہیں۔ یہ اللہ اور شریعت پر ان کا بہتان تھا اور اس کے خلاف شریعت ہونے سے وہ خود بھی واقف تھے لیکن محض اپنی خواہشات کی پیروی اور حرص دنیا میں انھوں نے اس قسم کے حیلے ایجاد کر لیے تھے بعد میں یہی فتوے تحریف کی راہ سے تورات میں داخل ہو گئے یہاں تک کہ اب اگر کوئی تورات کو پڑھے تو وہ عام اخلاقی و انسانی حقوق و معاملات میں بھی محسوس کرتا ہے کہ بنی اسرائیل کے لیے شریعت کچھ اور ہے اور غیر بنی اسرائیل کے لیے، جن کو تورات میں اجنبیوں اور پردیسیوں سے تعبیر کیا جاتا ہے، کچھ اور۔

بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ (۷۶)

اس آیت میں اور اس اسلوب پر جتنی بھی آیات ہیں سب میں جواب شرط محذوف ہوتا ہے۔ اس کی بعض مثالیں سورہ بقرہ میں ہم پیش کر چکے ہیں۔ یہاں اگر جواب شرط کو واضح کیا جائے تو پوری بات یوں ہو گی کہ ہاں جو لوگ اللہ کے عہد کو پورا کریں اور حدود الٰہی کی حفاظت کریں تو وہ لوگ متقی ہیں اور

اور اللہ متقین ہی کو دوست رکھتا ہے۔

یہ آیت یہود کی اوپر والی باتوں پر استدراک کی حیثیت رکھتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہود کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ ان کے لیے خدا کے ہاں کوئی خاص مرتبہ و مقام ہے جس کے سبب سے وہ دوسروں سے بالاتر اور رعایتوں کے معاملے میں ذمہ داریوں سے بری ہیں۔ اصل یہ ہے کہ اللہ کے ہاں جو مرتبہ و مقام بھی ہے وہ ان لوگوں کے لیے ہے جو خدا سے باندھے ہوئے عہد کو پورا کریں اور ہر طرح کے حالات میں اس عہد کے تحت قائم کردہ حدود کی نگہداشت کریں۔ جن لوگوں کی روش یہ ہوگی وہ اللہ کے نزدیک متقی ہیں اور اللہ ایسے ہی متقی بندوں کو دوست رکھتا ہے۔ جو لوگ خدا کے عہد اور اس کے حدود کو توڑنے میں بے باک ہیں اور اس کے باوجود تقویٰ اور محبوبِ الٰہی ہونے کے مدعی ہیں وہ محض خیالی پلاؤ پکا رہے ہیں۔

عام طور پر مترجمین قرآن نے ادفی بعھدہ کا ترجمہ "اپنے عہد کو پورا کرتے ہیں" کیا ہے۔ میرے نزدیک ضمیر کا مرجع اللہ ہے۔ قرآن کے نظایر سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔ آگے والی آیت ملاحظہ ہو۔ ابن جریر نے بھی یہی تاویل کی ہے۔

آگے کا مضمون آیات ۷۷—۸۰

آگے کی آیات میں پہلے تو اہل کتاب کی اس عہد شکنی بلکہ عہد فروشی پر عتاب ہے جس کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ فرمایا کہ اللہ نے ان کو اپنے کلام و پیام سے نوازا، ان کے لیے تعلیم و تزکیہ کا اہتمام فرمایا اور ان کو اپنی نگاہِ لطف و کرم سے مشرف کیا لیکن انھوں نے دنیا کے حقیر مفادات کے بدلے میں اللہ کے عہد کو فروخت کیا اور اس کی بے پایاں عنایات کی نہایت بے دردی کے ساتھ ناقدری کی اس وجہ سے اب آخرت میں ان کے لیے کوئی حصہ باقی نہیں رہا۔

پھر ان کی بعض تحریفی کوششوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ اللہ نے جو کتاب انہیں ہدایت و رہنمائی کے لیے عطا فرمائی، انہوں نے اس میں توڑ مروڑ اور لچک لچکا کر اس غرض کے لیے تصرفات کیے کہ جو چیز اللہ کی کتاب کی نہیں تھی وہ کتاب کی چیز سمجھی جائے۔

پھر اہل کتاب بالخصوص نصاریٰ کو دعوت دی ہے کہ وہ عقل سلیم کی روشنی میں غور کریں کہ آج جن باتوں کو وہ مسیح کی طرف منسوب کرتے ہیں وہ باتیں وہ کتاب، وحکمت اور نبوت کے حامل ہوتے ہوئے

کس طرح کہہ سکتے ہیں؟

اب اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔ ارشاد ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَیْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِیْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ وَلَا یُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا یَنْظُرُ اِلَیْهِمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَلَا یُزَكِّیْهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۝ وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِیْقًا یَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ ۚ وَیَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَیَقُوْلُوْنَ عَلَی اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ ۝ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّؤْتِیَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ یَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّیْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِیّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۝ وَلَا یَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِیّٖنَ اَرْبَابًا ۭ اَیَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝

جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کو ایک حقیر قیمت کے عوض بیچتے ہیں ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ اور اللہ نہ ان سے بات کرے گا، نہ ان کی طرف قیامت کے دن دیکھے گا اور نہ ان کو پاک کرے گا۔ ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔ ۷۷

اور ان میں ایک گروہ ان لوگوں کا بھی ہے جو اپنی زبان کو کتابِ الٰہی کے ساتھ توڑتا موڑتا ہے تاکہ تم اس کو کتاب الٰہی کا ایک حصہ سمجھو حالانکہ وہ کتاب الٰہی کا حصہ نہیں اور وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس سے ہے حالانکہ وہ اللہ کے پاس سے نہیں ہے۔ وہ اللہ پر جانتے بوجھتے جھوٹ باندھتے ہیں۔ ۷۸

کسی بشر سے یہ ممکن نہیں کہ اللہ اس کو کتاب، قوت فیصلہ، اور منصب نبوت عطا فرمائے پھر وہ لوگوں کو یہ دعوت دے کہ لوگو! اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ بلکہ وہ تو لوگوں کو یہی دعوت دے گا کہ لوگو اللہ والے بنو بوجہ اس کے کہ تم کتابِ الٰہی کی دوسروں کو تعلیم دیتے ہو اور خود بھی اس کو پڑھتے ہو۔ اور نہ یہ ممکن ہے کہ وہ تمہیں یہ حکم دے کہ فرشتوں اور نبیوں کو رب بناؤ۔ کیا وہ تمہیں کفر کا حکم دے گا بعد اس کے کہ تم خدا کے فرمانبردار ہو۔ ۷۹-۸۰

الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی وضاحت

اِنَّ الَّذِیْنَ یَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَیْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِیْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ وَلَا یُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا یَنْظُرُ اِلَیْهِمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَلَا یُزَكِّیْهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (۷۷)

"اشتراء" کے لفظ پر سورہ بقرہ کی تفسیر میں بحث گزر چکی ہے۔ جب مبادلہ چیز کا چیز سے ہو، جس کا عموماً قدیم زمانہ میں رواج تھا تو ہر شے مبیع بھی ہو سکتی ہے اور ثمن بھی۔ اس وجہ سے کسی شے کا اشتراء درحقیقت اس مفہوم میں خریدنا نہیں ہوتا تھا جس مفہوم میں ہم خریدنا بولتے ہیں بلکہ اس کا مفہوم مبادلہ ہوتا تھا۔ اس وجہ سے "اشتراء" کا لفظ بدلنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور پھر اس مفہوم سے ترقی کر کے ترجیح دینے کے معنی میں بھی۔

"عَهْدُ اللّٰهِ" سے مراد کتاب و شریعت ہے اس لیے کہ کتاب و شریعت کی حیثیت اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان معاہدے کی ہوتی ہے۔ یہاں اس عام مفہوم کے اندر ایک خاص اشارہ اس عہد کی طرف بھی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب سے آخری بعثت کے باب میں لیا تھا اور جس کو اہل کتاب نے نہ صرف نسیاً منسیاً کر دیا تھا بلکہ اس کے آثار انھوں نے اپنی کتابوں سے بھی مٹا ڈالنے کی کوشش کی تھی۔

"اَیْمَان" سے مراد وہ عام عہد و پیمان ہیں جن پر اجتماعی و تمدنی زندگی کی بنیاد ہوتی ہے اور جن سے معاشرتی زندگی اور معاملات میں اعتماد اور حسن ظن کی فضا بنتی ہے۔ یہود کا اس معاملے میں جو حال تھا وہ اوپر واضح ہو چکا ہے کہ انہوں نے امانتوں میں خیانت کرنے اور اپنے کیے ہوئے عہد و پیمان کی ذمہ داریوں سے فرار کے لیے کیسے کیسے شرعی حیلے ایجاد کر لیے تھے۔ لَا یُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا یَنْظُرُ اِلَیْهِمْ میں فعل کی نفی اس کے حقیقی معنی کے اعتبار سے ہے یعنی اللہ تعالیٰ ان سے اس معنی میں کلام نہیں کرے گا یا ان کی طرف نظر نہیں کرے گا جو کلام کرنے اور نظر کرنے کا اصلی مفہوم ہے۔ یہ اسلوب عربی زبان میں عام ہے بلکہ ہر زبان میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنے قول و قرار کو اس طرح خریدنی و فروختنی

چیز بنائے ہوئے ہیں اور اپنے دنیوی مفادات پر (جن کی بڑی سے بڑی مقدار بھی اجرِ آخرت کے بالمقابل حقیر ہی ہے) ان کو اس بیدردی سے قربان کر رہے ہیں ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے، وہ اپنے جواہرات کو کوڑیوں کے عوض فروخت کر چکے ہیں اور جو لوگ اللہ کی امانت کے معاملے میں ایسے نااہل ثابت ہوئے ان سے نہ تو اللہ اب بات کرے گا، نہ ان کی طرف نظر کرے گا، اور نہ ان کو پاک کرے گا۔ اب آخرت میں ایسے شامت زدوں کے لیے دردناک عذاب کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

الفاظ کے تیور جو لوگ پہچانتے ہیں وہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہاں ان کے اندر کتنی نفرت اور کیسی شدید بیزاری چھپی ہوئی ہے لیکن اہل کتاب بالخصوص یہود اپنی ان کارستانیوں کے باعث جن کا اوپر ذکر ہوا اسی کے سزاوار تھے۔ خاص طور پر اس وجہ سے بھی کہ یہ وہ قوم تھی جس کو اللہ تعالیٰ نے اس کے پیغمبر کے واسطہ سے اپنے خاص کلام و خطاب کے شرف سے نوازا۔ یہ فرعونیوں کے قدموں کے نیچے روندی جا رہی تھی تو خدا نے اس پر عنایت کی نظر کی اور اس کو اس ذلت سے نکال کر سیادت و امامت کے تخت پر بٹھایا، اس کے تزکیہ کے لیے کتاب نازل فرمائی اور اس کو سنوارنے اور سدھارنے کے لیے اس کے اندر اپنے نبی اور رسول بھیجے لیکن اس قوم نے نہ تو اس خطاب و کلام کی کچھ قدر کی اور نہ اس نظرِ شفقت و عنایت اور اس تزکیہ و تطہیر کی جس کا خدا اور اس کے نبیوں نے یہ کچھ اہتمام کیا تو اب اس قوم کا کیا منہ ہے کہ اللہ اس سے بات کرے، یا اس کی طرف نظر کرے یا اس کو پاک کرے اب تو اس نے اپنے اوپر امید کے سارے دروازے خود بند کر لیے ہیں۔

اس آیت میں تزکیہ کی جو نفی ہے اس کے دو پہلو ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ آخرت تزکیہ کا محل نہیں ہے۔ اس کا محل یہ دنیا ہے۔ جب انھوں نے یہاں اس کا موقع ضائع کر دیا تو آخرت میں وہ اس کو حاصل نہ کر سکیں گے۔ دوسرا یہ کہ ان کے جرائم ایسے نہیں ہیں کہ یہ آخرت میں تھوڑی بہت سزا پا کر ان سے پاک ہو جائیں بلکہ یہ جرائم ان کو ہمیشہ ہمیش کے لیے جہنم میں لے ڈوبنے والے ہیں۔

وَإِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيقًا يَلْوُونَ أَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتَابِ لِتَحْسَبُوهُ مِنَ الْكِتَابِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتَابِ وَيَقُولُونَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ۝

لوی، یلوی، لیاً کے معنی کسی چیز کو بٹنے، توڑنے مروڑنے اور اینٹھنے کے ہیں۔ یَلْوُنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ کے معنی ہوئے کہ کتابِ الٰہی کے بعض الفاظ ادا کرتے ہوئے اپنی زبان کو اس طرح توڑتے مروڑتے ہیں کہ الفاظ کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں۔

یہ اہل کتاب کی ان تدبیروں میں سے ایک تدبیر ہے جو انہوں نے عہد الٰہی کی ذمہ داریوں سے فرار کے لیے اختیار کی تھیں تفسیر بقرہ میں جہاں ہم نے تحریف کے سوال پر بحث کی ہے وہاں ہم نے بتایا ہے کہ تحریف کے طریقوں میں سے ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ قرارت کی راہ سے لفظ یا جملہ کا تلفظ توڑ مروڑ کر اس طرح بگاڑ دیتے تھے کہ اصل حقیقت بالکل گم ہو کر رہ جاتی تھی۔ اس جرم کا ارتکاب یہود اور نصاریٰ دونوں ہی نے کیا ہے۔ اس کی مثال میں ہم نے لفظ "مروہ" کا ذکر کیا ہے۔ یہ لفظ تورات میں حضرت ابراہیمؑ کی سرگزشت کے سلسلہ میں آیا ہے کہ اس مقام پر ان کو بیٹے کی قربانی کا حکم ہوا۔ یہود نے اس قربانی کے واقعے میں جہاں کمی اور بیشی کی نوعیت کی بہت سی تبدیلیاں کی ہیں وہیں لفظ مروہ کی قرأت کو بگاڑ کر مریا، موریا، موریاہ، مورہ اور نہ جانے کیا کیا بنایا تاکہ مکہ کی مشہور پہاڑی مروہ کے بجائے اس سے بیت المقدس کے کسی مقام کو مراد لے سکیں اور اس طرح حضرت ابراہیمؑ اور ان کی ہجرت و قربانی کے واقعہ کا تعلق بیت اللہ سے بالکل کاٹ دیں۔ مقصد اس ساری کاوش سے ان کا یہ تھا کہ اس ایرپھیر سے ان پیشین گوئیوں اور اشارات کا رخ موڑا جا سکے جو بنی اسماعیل اور ان کے اندر نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق تورات کے صحیفوں میں وارد تھیں۔ اسی طرح کی حرکت انھوں نے لفظ "بکہ" کی قرأت میں کی جس پر آگے چل کر ہم بحث کریں گے۔

اس سازش کے ذکر کے بعد ان کی جسارت اور ڈھٹائی کی طرف توجہ دلائی کہ یہ حرکت وہ اس مقصد سے کرتے ہیں کہ جو چیز کتابِ الٰہی کی نہیں ہے اس پر کتابِ الٰہی کا لیبل چسپاں کر دیں اور جو چیز اللہ کی طرف سے نہیں ہے اس کو اللہ کے نام سے پیش کریں۔ فرمایا کہ یہ جانتے بوجھتے اللہ کے اوپر جھوٹ باندھنا ہے اور اللہ پر جھوٹ باندھنے سے بڑی جسارت اور کیا ہو سکتی ہے۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۙ وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ؕ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ

بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۸۰

"حکم" کے معنی قضا اور فیصلہ کے ہیں۔ اپنے اسی مفہوم کی رو کو لیے ہوئے یہ قرآن میں تین مختلف پہلوؤں سے استعمال ہوا ہے۔

بعض جگہ مجرد فیصلہ کے معنی میں مثلاً وکنا لحکمھم شاھدین (۷۸۔ انبیا) (اور ہم ان کے فیصلہ کے وقت موجود تھے) اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا (۵ مائدہ ۵) (کیا وہ جاہلیت کے فیصلہ کے طالب ہیں اور اللہ سے بڑھ کر کون فیصلہ کرنے والا ہے)

بعض مقامات میں قوتِ فیصلہ اور بصیرت کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً ولوطًا اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا (۷۴ انبیا) (اور لوط کو ہم نے قوتِ فیصلہ عطا فرمائی اور علم) وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا وَّحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً ۱۲ - مریم (اور ہم نے اس کو بچپن میں فیصلہ کی قوت دی اور خاص اپنے پاس سے سوز و گداز اور پاکیزگی)

بعض آیات میں امر و حکم کے معنی میں ہے مثلاً فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ (۱۲۔ غافر) (پس حکم خدائے بلند و بزرگ کے لیے ہے) وَلَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۷۰ قصص (اور اسی کے لیے حکم ہے اور تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے)

یہاں موقع و محل پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ اپنے دوسرے اور تیسرے مفہوم میں استعمال ہوا ہے[1]

"ربانی" کے معنی خدا پرست اور اللہ والے کے ہیں۔ یہ لفظ عربی میں عبرانی سے آیا ہوا معلوم ہوتا ہے "ربی" کا لفظ تورات اور انجیل میں بہت آیا ہے۔ صورت ذرا دونوں کی مختلف ہے لیکن معنا کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا۔

اس آیت کا رخ خاص طور پر نصاریٰ کی طرف ہے جو اس سورہ میں اصلاً مخاطب ہیں۔ اب تک کی بحث بیشتر نقل پر مبنی تھی۔ اس آیت میں عقلِ سلیم کو مخاطب کیا ہے اور فرمایا ہے کہ سوچنے کی بات ہے کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک انسان جس کو اللہ تعالیٰ کتاب و حکمت اور نبوت سے سرفراز فرمائے، وہ لوگوں

---

[1] لفظ "حکم" کی یہ تحقیق استاذ امامؒ کا افادہ ہے۔

(بقیہ بر صفحہ ۵۶)

افادات فراہی
خالد مسعود

عقیدۂ شفاعت

جس طرح رسول اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کے لیے بشیر و نذیر بن کر آتا ہے، اسی طرح اس کی ایک مستقل حیثیت یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ پروردگار کے سامنے ان کا وکیل اور شفیع بھی ہوتا ہے۔ اس شفاعت کے کئی مواقع ہوتے ہیں۔ شفاعت کا پہلا موقع تو وہ ہوتا ہے جب لوگ اسلام قبول کرتے ہیں تو نبی ان کے لیے مغفرت کی دعا کرتا ہے۔ قرآن میں اس امر کا کئی جگہ ذکر ہوا ہے۔ شفاعت کا دوسرا موقع وہ ہوتا ہے جب بندے گناہ کے مرتکب ہونے پر رب کی طرف رجوع کر لیتے ہیں اور اس سے مغفرت کے طالب ہوتے ہیں تو رسول بھی ان کے لیے استغفار کرتا ہے، یعنی اس کی حیثیت بندوں کے لیے ایک قابلِ اعتماد امین کی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ ایمان پر یہ بات واجب کر دی گئی ہے کہ وہ اپنے مابین کے تمام مقدمات رسول کے سامنے فیصلہ کے لیے پیش کریں۔ اگر وہ ایسا کرنے پر تیار نہ ہوں تو گویا انھوں نے اس کو صحیح معنوں میں نبی تسلیم نہیں کیا۔ شفاعت کا تیسرا موقع قیامت میں پیش آئے گا۔ وہ لوگ جنھوں نے نبی کا زمانہ نہیں پایا، جب توبہ و استغفار کرتے ہیں تو بسا اوقات اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول فرماتا ہے مگر کبھی کبھی ان کی توبہ نبی کی شفاعت کی طرف پھیر دی جاتی ہے۔ یہ معاملہ کبائر کی شکل میں پیش آتا ہے۔

قرآن میں ارشاد ہے۔

اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ (نساء ۔ ۳۱)	اگر تم ان بڑے گناہوں سے بچتے ہو گے جن سے تم کو روکا جاتا ہے، تو ہم تمہارے گناہ تم سے جھاڑ دیں گے۔
اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ حَتّٰٓى	خدا انہیں لوگوں کی توبہ قبول فرماتا ہے جو نادانی سے بری حرکت کر بیٹھتے ہیں، پھر جلد توبہ کر لیتے ہیں پس ایسے لوگوں پر خدا مہربانی کرتا ہے اور وہ علم والا اور حکمت والا ہے۔ اور ایسے لوگوں کی توبہ قبول نہیں ہوتی جو برے کام کرتے رہتے ہیں

إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّي تُبْتُ الْآنَ وَلَا الَّذِينَ يَمُوتُونَ وَهُمْ كُفَّارٌ أُولَٰئِكَ أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا (نساء - ۱۷، ۱۸)

یہاں تک کہ جب کسی کو موت آ لے تو وہ کہنے لگتا ہے کہ اب میں توبہ کرتا ہوں اور نہ ان کی جو کفر کی حالت میں مریں۔ ایسے لوگوں کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ وہ شخص جو نادانی میں بدی کا مرتکب ہو جاتا ہے، اگر فوراً تائب ہو جائے تو اس کی مغفرت ہو جاتی ہے۔ اسی طرح وہ شخص جو گناہ کرنے کے بعد توبہ نہیں کرتا یہاں تک کہ موت اس کو آ لے، خدا کے ہاں مغفرت نہیں پا سکتا۔ لیکن یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں خاموش ہے جن سے جانتے ہوئے گناہ سرزد ہو جاتا ہے اور وہ کبائر سے اجتناب نہیں کر پاتے، وہ توبہ کرتے ہیں مگر کچھ مدت کے توقف کے بعد، اگرچہ یہ وقت موت کی کیفیت طاری ہونے سے بہت پہلے ہوتا ہے، یہ لوگ استغفار بھی کرتے ہیں مگر ان کو رسول کا زمانہ نصیب نہیں ہوتا کہ وہ بھی ان کے لیے مغفرت کا طالب ہو۔ ایسی لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ قیامت کے روز رسول کو خاص اذن دے گا اور وہ ان کی شفاعت کریں گے۔ ایسے لوگوں کو بشارت دنیا ہی میں دے دی گئی ہے، فرمایا۔

قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ (زمر - ۵۳)

کہو، اے میرے بندو! جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہونا خدا سب گناہوں کو معاف کر دیتا ہے وہ تو بخشنے والا اور مہربان ہے۔

یعنی اللہ کی طرف رجوع کرو اور اس سے مغفرت چاہو کیونکہ وہ بخشنے والا ہے اور مومن کی صفت یہ ہوتی ہے کہ اپنے رب ہی سے امید رکھتا اور اسی سے خوف کھاتا ہے، لہذا وہ ہمیشہ توبہ کرتا ہے اور کبھی مایوس نہیں ہوتا۔ اسی طرح یہ بھی فرمایا۔

لَا تَيْأَسُوا مِن رَّوْحِ اللَّهِ إِنَّهُ لَا يَيْأَسُ مِن رَّوْحِ اللَّهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْكَافِرُونَ (یوسف ۸۷)

خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہونا کہ خدا کی رحمت سے وہی لوگ ناامید ہوا کرتے ہیں جو کافر ہیں۔

شفاعت کے جن تین مواقع کا ہم نے ذکر کیا ہے، ان تینوں سے پہلے گنہ گار کا خود توبہ و استغفار

کرنا ضروری ہوتا ہے اور یہی شفاعت کی حقیقت ہے۔ اس طرح شفاعت کرنے والا استغفار کرنے میں دوسرے نمبر پہ ہوتا ہے اور گنہ گار کی زبان بنتا ہے، گویا گنہ گار عاجزی اور دعا میں شافع کا وسیلہ پکڑتا ہے۔ اسی اصل پر ہماری نمازوں اور دعاؤں کی بنا کی گئی ہے۔ امام دعا کرتا ہے اور مقتدی آمین کہتے ہیں۔ انبیاء کا طریقہ بھی یہی رہا ہے کہ وہ اپنی امت کے افضل ترین لوگوں کو امت کی شفاعت کے لیے اپنے ساتھ شریک کرتے تھے تاکہ تنہا ان کے دعا کرنے سے شفاعت محض مجادلہ کی شکل اختیار نہ کرلے۔ اس بات کا مشاہدہ ہم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جبل زیتون پر کی آخری دعا میں بھی کرتے ہیں اور غزوۂ بدر کے دن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا میں بھی کرتے ہیں۔ بدر میں اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی دعا قبول فرمائی اور نبیؐ اور ان کے اصحاب کو اپنے وعدہ اور سنت کے مطابق نصرت عطا فرمائی، جیسا کہ فرمایا:۔

وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ — اور خدا اس شخص کی مدد ضرور کرتا ہے جو خدا کی مدد کرتا ہے۔ (حج - ۴۰)

یہ نصرت اس وقت تک ظاہر نہ ہوئی جب تک نبی اور ان کے ساتھیوں نے اپنا ذمہ پورا نہ کر دکھایا۔ انہوں نے ثابت قدمی دکھائی، تکالیف برداشت کیں، خدا کے لئے ہجرت کی، اپنے گھروں اور مالوں کو خیرباد کہہ دی اور اپنی جانوں کو پروردگار کی راہ میں ڈال دیا، تب ان پر نصرت نازل ہوئی۔ اس نصرت کا ظہور بدر کے دن ہوا اگرچہ اس کے آثار ہجرت کے بعد ظاہر ہونے لگے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

اگر تم نبی کی مدد نہ کروگے تو خدا اس کا مددگار ہوگا۔ اس نے اس کی مدد اس وقت کی جب کافروں نے اس کو نکالا جب وہ دو میں کا دوسرا تھا۔ یاد کرو جب وہ دونوں غار میں تھے اور وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا غم نہ کر اللہ ہمارا مددگار ہے تو اس نے اس پر تسکین نازل کی اور اس کی مدد ایسے لشکروں

السُّفْلٰى وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ۔ (توبہ - ۴۰)

سے کی جن کو تم دیکھ نہیں سکتے اور کافروں کی بات کو پست کیا اور بات تو اللہ ہی کی بلند ہوتی ہے۔ اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔

غیر مرئی لشکروں کے ساتھ مدد بدر کے موقع پر ہوئی۔ اب دیکھیے کہ ہجرت اور جنگ بدر کے دو مواقع کو بُعد زمانی کے باوجود اس آیت میں کیسے جمع کر دیا ہے۔ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر خدا نے نصرت کے ظہور میں تاخیر کی تو اس میں بھی اس کی حکمت کو دخل تھا۔

جہاں تک حضرت مسیح علیہ السلام کی دعا کا تعلق ہے، آپ کے شاگردوں نے اس میں آپ کا ساتھ نہ دیا۔[1] لہٰذا یہ دعا شفاعت کا درجہ حاصل نہ کر سکی۔ اسی لیے حضرت مسیحؑ کو علم ہو گیا کہ یہود کے لیے اب کسی خیر کی امید نہیں، ان پر لعنت پڑ چکی ہے۔ چنانچہ آپ اللہ تعالیٰ کے فیصلہ پر راضی ہو گئے کیونکہ وہ عدل کے ساتھ فیصلہ کرتا اور حکمت کے ساتھ رحم کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب گنہگار بے پروائی اختیار کرے اور منہ پھیرے رہے تو شفاعت کی شرائط پوری نہیں ہوتیں اور اس کی حیثیت

---

[1] یہاں جس واقعہ کی طرف اشارہ ہے اس کی تفصیل متی باب ۲۶ میں یوں بیان کی گئی ہے۔

"اس وقت یسوع ان کے ساتھ گتسمنی نام ایک جگہ میں آیا اور اپنے شاگردوں سے کہا یہیں بیٹھے رہنا جب تک کہ میں وہاں جا کر دعا کروں اور پطرس اور زبدی کے دونوں بیٹوں کو ساتھ لے کر غمگین اور بیقرار ہونے لگا۔ اس وقت اس نے ان سے کہا میری جان نہایت غمگین ہے، یہاں تک کہ مرنے کی نوبت پہنچ گئی ہے، تم یہاں ٹھہرو اور میرے ساتھ جاگتے رہو۔ پھر ذرا آگے بڑھا اور منہ کے بل گر کر یوں دعا کی کہ اے میرے باپ! اگر ہو سکے تو یہ پیالہ مجھ سے ٹل جائے، تو بھی نہ جیسا میں چاہتا ہوں بلکہ جیسا تو چاہتا ہے ویسا ہی ہو۔ پھر شاگردوں کے پاس آ کر ان کو سوتے پایا اور پطرس سے کہا کیا تم میرے ساتھ ایک گھڑی بھی نہ جاگ سکے؟ جاگو اور دعا کرو تاکہ آزمائش میں نہ پڑو۔ روح تو مستعد ہے مگر جسم کمزور ہے۔ پھر دوبارہ اس نے جا کر یوں دعا کی کہ اے میرے باپ! اگر یہ میرے پیے بغیر نہیں ٹل سکتا تو تیری مرضی پوری ہو۔ اور آ کر پھر انہیں سوتے پایا کیونکہ ان کی آنکھیں نیند سے بھری تھیں اور ان کو چھوڑ کر پھر چلا گیا اور پھر وہی بات کہہ کر تیسری بار دعا کی۔ تب شاگردوں کے پاس آ کر ان سے کہا اب سوتے رہو اور آرام کرو۔ دیکھو وقت آ پہنچا ہے اور ابن آدم گنہگاروں کے حوالے کیا جاتا ہے۔" (رخ-م)

محض مجادلہ کی ہو جاتی ہے۔ ایسا اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ کمال رافت کی وجہ سے عدل و حکمت کی رعایت نبی کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے اور وہ مجادلہ کرنے لگتا ہے، تاہم وہ اس میں قابل ملامت نہیں ہوتا۔ اب ہم نبی کے احوال کے اس گوشہ پر روشنی ڈالیں گے۔

مجادلہ قرآن مجید اور تورات میں بیان ہوا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قوم لوط کے لیے رحمت طلب کرنے میں اور اپنے والد کے لیے استغفار کرنے میں بہت الحاح کی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے اس فعل کا تذکرہ اگرچہ مدح کے ساتھ کیا ہے لیکن قوم لوط اور آزر کے ساتھ معاملہ ان کے اعمال کے مطابق ہی کیا۔ یہ بات واضح کی گئی ہے کہ حضرت ابراہیم نے الحاح اس وقت کی جب تک انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ یہ لوگ خدا کے دشمن ہیں۔ جونہی ان کے علم میں یہ بات آئی، آپ دعا سے رک گئے یہی بات انبیاء اور صالحین کے مقام سے مناسبت رکھتی ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کو ایک اسوہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔

پھر ہمارے لیے یہ بات بھی واضح کی گئی ہے کہ کسی غیر مستحق کے لیے مغفرت طلب کرنا آخرت میں بالکل بے سود ہوگا کیونکہ وہاں اللہ تعالیٰ ہر شخص کو ان اعمال کے مطابق ٹھیک ٹھیک بدلہ دے گا جن کا وہ خود گواہ ہے یا جن کی رسول شہادت دے گا۔ مزید برآں رسول اور مومنین کو یہ ہدایت دی کہ وہ عمومی استغفار کرتے رہا کریں تاکہ اس سے ہر اس شخص کو فائدہ پہنچے جو اس کا اہل ہو۔ ہماری اس بات پر قرآن مجید میں متعدد شہادتیں موجود ہیں، مثلاً فرمایا:

إِنَّا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ	بے شک ہم نے تم پر کتاب نازل کی حق کے ساتھ
بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ	تاکہ تم لوگوں کے درمیان خدا کی ہدایت (یعنی حق)
النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ ۚ	کے مطابق فیصلہ کرو اور خیانت کرنے والوں کی حمایت
وَلَا تَكُنْ لِلْخَائِنِينَ خَصِيمًا	میں بحث نہ کرنا (یعنی حق کے مطابق فیصلہ نافذ کرنے
وَاسْتَغْفِرِ اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ	میں رأفت مانع نہ آئے) اور (توبہ کرنے والوں کے
كَانَ غَفُورًا رَحِيمًا	لیے) مغفرت مانگتے رہنا، بے شک خدا بخشنے والا
وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِينَ	مہربان ہے اور جو لوگ اپنے آپ سے خیانت کرتے
يَخْتَانُونَ أَنْفُسَهُمْ	ہیں ان کی طرف سے جھگڑا نہ کرنا (یعنی وہ لوگ

اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ مَنْ کَانَ	جو اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں، پھر توبہ نہیں کرتے
خَوَّانًا اَثِیْمًا یَّسْتَخْفُوْنَ	ان کو کسی دوسرے کی استغفار نفع نہیں دے سکتی،
مِنَ النَّاسِ وَلَا یَسْتَخْفُوْنَ	بے شک اللہ خائن اور گنہگار کو ناپسند کرتا ہے۔
مِنَ اللّٰهِ وَهُوَ مَعَهُمْ	(لہٰذا تم ان کے لیے استغفار نہ کرو) یہ لوگوں سے
اِذْ یُبَیِّتُوْنَ مَا لَا	تو چھپتے ہیں مگر اللہ سے نہیں چھپ سکتے اور جب
یَرْضٰی مِنَ الْقَوْلِ وَ	وہ راتوں کو ایسی باتوں کے مشورے کرتے ہیں
کَانَ اللّٰهُ بِمَا یَعْمَلُوْنَ	جو اس کو پسند نہیں تو وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے
مُحِیْطًا ۝ هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ	اور خدا ان کے اعمال کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔
جٰدَلْتُمْ عَنْهُمْ فِی	(قیامت میں تمہیں کہا جائے گا کہ) تم لوگ دنیا کی
الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا فَمَنْ	زندگی میں تو ان کی طرف سے بحث کر لیتے تھے، اب
یُّجَادِلُ اللّٰهَ عَنْهُمْ	قیامت میں ان کی طرف سے خدا کے ساتھ کون جھگڑے گا
یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَمْ مَّنْ یَّكُوْنُ	اور کون ان کا وکیل بنے گا (یعنی منافقین کے لیے
عَلَیْهِمْ وَكِیْلًا ۝ وَمَنْ یَّعْمَلْ	اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ توبہ کرتے رہیں
سُوْٓءًا اَوْ یَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ	اور کسی کی حمایت پر بھروسہ نہ رکھیں کیونکہ) اور جو شخص
یَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ یَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا	برائی کرے یا اپنی جان پر ظلم کرے پھر اللہ سے مغفرت
رَّحِیْمًا (نساء ۱۰۵-۱۱۰)	مانگے تو وہ خدا کو بخشنے والا اور رحم کرنے والا پائے گا۔

شفاعت کی ایک اہم خصوصیت شفاعت کے بارے میں یہ جاننا چاہیئے کہ یہ اذن اور سوال کے بعد ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا	اور وہ کہتے ہیں خدا نے اولاد ٹھہرائی، وہ پاک
سُبْحٰنَهٗ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ	ذات ہے بلکہ وہ تو معزز بندے ہیں، وہ خدا کے
لَا یَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ	آگے بڑھ کر بول نہیں سکتے اور اس کے حکم کے
بِاَمْرِهٖ یَعْمَلُوْنَ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ	مطابق عمل کرتے ہیں۔ وہ خوب جانتا ہے جو
اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا یَشْفَعُوْنَ	کچھ ان کے آگے اور ان کے پیچھے ہے اور وہ کسی

(بقیہ بر صفحہ ۵۴)

اسرار احمد

حقیقتِ زندگی

زندگی محض "عناصر میں ظہورِ ترتیب" ہی کا نام ہے یا اس "پردہ زنگاری" میں کوئی حقیقتِ کبریٰ "معشوق" بنی چھپی بیٹھی ہے؟ اسی طرح موت زندگی کے خاتمے کا نام ہے یا یہ بجائے خود زندگی ہی کا ایک "وقفہ" ہے! ع "یعنی آگے بڑھیں گے دم لے کر!"

ہم اپنی زندگی کو "امروز و فردا" کے پیمانوں سے ناپیں اور حسرت سے پکار اٹھیں کہ ؎

"عمرِ دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں"

یا اسے ع "جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں" مانیں اور اپنی ابدیت کے سرور انگیز تصور سے شاد کام ہوں؟

اس مسئلے کے حل کا سارا دار و مدار اس پر ہے کہ آیا ہم محض "عالمِ محسوسات" تک محدود رہنے کا فیصلہ کرتے ہیں اور صرف حواسِ خمسہ کی محدود دریافتوں پر اکتفا کرتے ہیں یا عقل و وجدان کی قوتوں کو بھی کام میں لاتے ہیں اور "اپنے من میں ڈوب کر" "سراغِ زندگی" کو پانے کی سعی کرتے ہیں۔

"عالمِ محسوسات" اور "حواسِ خمسہ" تک محدود رہیئے تو زندگی بس پیدائش سے موت تک کے وقفے کا نام ہے۔ قرآن مجید ان مومنین تجربہ و شہود کے تصورِ حیات کو ان الفاظ میں بیان فرماتا ہے:۔

اِنْ هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا وَمَا	ہمارے لیے زندگی نہیں مگر یہی دنیا کی
نَحْنُ بِمَبْعُوْثِیْنَ (الانعام)	اور ہم کو پھر نہیں زندہ ہونا۔
اور مَا هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ	کچھ نہیں بس یہی ہمارا جینا ہے دنیا کا، ہم
وَنَحْیٰی وَمَا یُهْلِكُنَا اِلَّا	مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور ہم جو مرتے ہیں

اَلدَّهْرُ (جاثیہ) سو محض زمانہ ہے۔

اور ان کے ذہن کی پستی اور علم کی کوتاہی پر ان الفاظ میں تبصرہ فرماتا ہے:۔

يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (الروم) یہ لوگ صرف دنیوی زندگی کے ظاہر کو جانتے ہیں۔

اور ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ (النجم) بس یہیں تک پہنچ ہے ان کی علم میں!

کیا واقعی زندگی بس اسی مختصر سے وقفے کا نام ہے؟ ہمارے حواسِ خمسہ یقیناً ولادت کے ماقبل اور موت کے مابعد کے بارے میں بالکل لاچار و بے بس ہیں۔ لیکن کیا عقلِ انسانی اسے باور کرتی ہے؟ ذرا آنکھیں بند کر کے اس وسیع و عریض کائنات کی عظمت و وسعت کا تصوّر کرو! پھر سوچو کہ اس کائنات کا مرکزی وجود انسان ہے۔ سلسلۂ تخلیق کا کمال! ارتقائے حیات کی آخری منزل!!

تو کیا اس کی حقیقت بس یہی کچھ ہے کہ بچپن کے "لَعِبٌ وَّلَهْوٌ"[1] اور بڑھاپے کے "لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا"[2] کے مابین ایک تھوڑے سے وقفے کے ہوش و شعور کا نام حیاتِ انسانی ہے۔ ع

"اِک ذرا ہوش میں آنے کے خطا وار ہیں ہم!"

جو کوئی "حیاتِ انسانی" کے اس تصوّر پر مطمئن ہو سکتا ہو[3]۔ وہ ہو! آخر سطحِ ارض پر انسان ہی تو نہیں بستے۔ لاتعداد حیوانات، چرند پرند بھی یہیں بس رہے ہیں، تو کون سے تعجب کی بات ہے

---

[1] اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ..... الآیۃ (سورۂ حدید)
جان لو کہ دنیا کی زندگی لعب و لہو ہے ..... الخ

[2] وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا (سورۂ حج)
اور تم میں سے کچھ لوٹائے جاتے ہیں نکمی عمر کو تاکہ نہ جانیں جاننے کے بعد کوئی چیز

[3] وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا (سورۂ یونس)
راضی ہو گئے حیاتِ دنیوی سے اور اسی پر مطمئن ہو گئے۔

کہ خود انسانوں میں ایک گروہ کثیر انسان نما حیوانوں ہی کا ہو!

لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ	وہ دل رکھتے ہیں لیکن غور نہیں کرتے آنکھیں
أَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ	رکھتے ہیں پر دیکھتے نہیں، کان رکھتے ہیں پر
لَا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ	سنتے نہیں، وہ حیوانوں کی مانند ہیں بلکہ ان
بَلْ هُمْ أَضَلُّ (سورہ اعراف)	سے بھی گئے گزرے۔

اپنی حقیقت سے بے خبر اور اپنی عظمت سے غافل یہ انسان نما حیوان در حقیقت اک ذرا ہوش میں آنے کے بھی بس مغالطے ہی میں مبتلا ہیں۔ وحی الٰہی تو انہیں زندہ ہی تسلیم نہیں کرتی ــــ

فَإِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتَىٰ وَلَا تُسْمِعُ	کیوں کہ تم مردوں کو نہیں سنا سکتے اور نہ ہی
الصُّمَّ الدُّعَاءَ (سورہ روم)	بہروں کو اپنی پکار سنا سکتے ہو

جن کا حال یہ ہو کہ ؎

"روح سے تھا زندگی میں بھی تہی جن کا جسد"

وہ کب حیاتِ انسانی کے لطیف حقائق کا ادراک کر سکتے ہیں! قفسِ حواس کے ان زندانیوں کو کون باور کرا سکتا ہے کہ ؎

"ایسے کچھ تار بھی ہیں سازِ حقیقت میں نہاں
چھو سکے گا نہ جنہیں زخمہ مضرابِ حواس" (باہر القادری)

ہاں! جن کا ذہن اس "چار دن" کی "عمر دراز" پر مطمئن نہ ہوتا ہو، جن کے جسدِ خاکی میں حیاتِ حقیقی کروٹیں لے رہی ہو اور جنہیں خود اپنے اندر ہی کی کوئی چیز اپنی عظمت کی جانب اشارے کرتی محسوس ہوتی ہو ان کے "ضمیر" پر جب "نزول کتاب" ہوتا ہے تو حقیقتِ حیات کی "گرہ"[1] کھلتی ہے اور وحیٔ الٰہی کی بدلی سے حقائق کی بارش ہوتی ہے تو ان کی عقل و وجدان کی پیاسی زمین کو ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے اسے بعینہٖ وہی چیز مل گئی جس کی اسے پیاس تھی ــــ اور تب وہ حیاتِ انسانی جو حواس خمسہ کی "بندگی"

---

[1] تیرے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب — گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف (اقبال)

میں گھُٹ کر جُوئے کم آب نظر آتی تھی ذہنِ انسانی کے ان کے چنگل سے "آزاد" ہوتے ہی ایک "بحرِ بیکراں"[1] کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور یہ "حیاتِ دنیوی" جو لاعلمی اور بے خبری میں "اصل حیات" قرار پا گئی تھی سُکڑ اور سمٹ کر اصل کتابِ حیات کے محض ایک دیباچے اور مقدمے کی شکل اختیار کر لیتی ہے!!

صاعقۂ حق کوند کر اعلان کرتا ہے ــــ

وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ (سورۃ عنکبوت) — اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہے۔

اور انسانوں کے اس عظیم ہجوم پر نظر ڈالتے ہوئے جو حیاتِ دنیوی کے لہو و لعب ہی کو اصل حیات قرار دیئے بیٹھا ہے حسرت کے ساتھ پکارتا ہے۔

لَوْ كَانُوا يَعْلَمُوْنَ (سورۃ عنکبوت) — کاش کہ یہ جانتے!

کبھی ڈانٹا جاتا ہے۔

كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ (سورۃ قیامہ) — کچھ نہیں بس تم دنیا سے محبت کرتے ہو اور آخرت کو تج دیتے ہو۔

کبھی شکوہ کیا جاتا ہے۔

بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى (سورۃ اعلیٰ) — تم حیاتِ دنیوی کو ترجیح دیتے ہو حالانکہ آخرت بہتر بھی ہے اور باقی رہنے والی بھی۔

اللہ، اللہ! کیا انقلاب ہے کہاں یہ ذہن کی تنگی کہ زندگی بس یہی زندگی ہے اور کہاں یہ وسعتِ نظر کہ حیات ابدی اور سرمدی ہے جس کی کوئی انتہا ہی نہیں! کجا یہ مایوس کن تصور کہ موت سلسلہ حیات کا اختتام ہے اور کجا اس حقیقت کا ادراک کہ موت تو اصل "شہرِ زندگی" کا "دروازہ" ہے۔

بدقسمتی سے اخروی زندگی کے "ماننے والوں" میں بھی کم بلکہ شاذ ہی اس کے "جاننے والے" ہیں اس کا "ماننا" جس قدر آسان ہے "جاننا" اسی قدر دشوار ہے۔ "ماننا" تو محض توارث سے بھی مل جاتا

---

[1] بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جُوئے کم آب — اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی — اقبال

ہے لیکن 'جاننے' کے لیے اپنے ظرفِ ذہنی کو وسیع و عمیق کرنے کی ضرورت ہے — اور اس کا موقعہ آج کی مادہ پرست دنیا میں کسے نصیب ہے!!

ماننے والوں کی ایک غالب اکثریت نے 'حیاتِ دنیوی' کو اصل کتاب 'جان کر' حیاتِ اخروی' کو بس اس کے تتمّے اور ضمیمے کی حیثیت سے 'مانا' ہے۔ حالانکہ 'جاننا' یہ چاہیئے کہ اصل کتابِ حیات تو موت کے بعد کھلنے والی ہے۔ یہ حیاتِ دنیوی تو بس اس کا ایک دیباچہ ہے یا مقدمہ! وہ حقیقت ہے اور یہ محض اس کا ایک عکس، وہ ابدی اور لامتناہی ہے اور یہ عارضی ہے اور مختتم، وہ حقیقی اور واقعی ہے اور یہ اس کے مقابلے میں محض کھیل تماشا بلکہ "متاعِ غرور" — آیاتِ بیّنات

وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ (سورہ رعد)	اور دنیا کی زندگی کچھ نہیں آخرت کے آگے مگر متاعِ حقیر۔
فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ (سورۃ توبہ)	سو کچھ نہیں نفع اٹھانا دنیا کی زندگی کا آخرت کے مقابلہ میں مگر تھوڑا۔
وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ (سورہ عنکبوت)	اور یہ دنیا کا جینا تو بس جی بہلانا اور کھیلنا ہے۔
اور وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ (سورۃ حدید و آلِ عمران)	اور دنیا کی زندگی تو یہی ہے مال دغا کا۔

اسی حقیقت پر شاہد ہیں۔

لیکن حیاتِ دنیوی کی یہ ساری بے بضاعتی اور کم مائگی حیاتِ اخروی کے مقابلے ہی میں ہے ورنہ بجائے خود یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ ذرا غور کرو جو کتاب حکیم "موت" کو بھی ایک مثبت حقیقت قرار دے جو 'حیات' ہی کی طرح تخلیق کے مراحل سے گزری ہے[1]۔ وہ حیاتِ دنیوی کو کب بے حقیقت ٹھہرا سکتی ہے

---

[1] خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (سورۃ ملک)

بنایا جینا اور مرنا تاکہ تم کو جانچے کون تم میں اچھا کرتا ہے کام۔ (ترجمہ شیخ الہندؒ)

یہ بے حقیقت صرف اس وقت بنتی ہے جب اس کا تقابل حیاتِ اخروی سے کیا جائے اور متاعِ غرور اس وقت قرار پاتی ہے جب نگاہیں اس پر اس طور سے مرکوز ہو جائیں کہ دل و دماغ حیاتِ اخروی سے محجوب ہو جائیں۔ یہی رمز ہے قرآن حکیم کے اس تبصرے میں کہ یَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ــــ یہ مومنین حیاتِ دنیوی، خود حیاتِ دنیوی کی حقیقت سے کب واقف ہیں! اس کا بھی بس "ظاہر" ہی ان کی نگاہوں کے سامنے ہے، خود اس کی حقیقت آشکارا ہو جائے تو حیاتِ انسانی کے جملہ حقائق تک رسائی کی راہیں روشن ہو جائیں۔

قرآن حکیم نے "حیاتِ دنیوی" کو "حیاتِ انسانی" کا ایک امتحانی وقفہ قرار دیا ہے ؎

خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ	بنایا جینا اور مرنا تاکہ تم کو جانچے کون تم میں
اَحْسَنُ عَمَلًا (سورۃ الملک)	اچھا کرتا ہے کام

یہ امتحان گاہ ہے، نتائج آخرت میں برآمد ہوں گے ؎

قلزمِ ہستی سے تو ابھرا ہے مانندِ حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی
یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے (اقبال)

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کو آخرت کی کھیتی سے تعبیر فرمایا ہے "الدنیا مزرعۃ الاخرۃ" ــــ غرض یہ کہ آخرت سے ملا کر دیکھو تو حیاتِ دنیوی بھی ایک ٹھوس حقیقت ہے، بصورتِ دیگر اس کا کوئی حقیقی وجود ہی نہیں رہ جاتا۔

آخرت سے قطع نظر، حیاتِ دنیوی کی حقیقت اس کے سوا اور کیا ہے کہ

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّ	جان رکھو کہ دنیا کی زندگی یہی ہے کھیل اور
لَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي	تماشا اور بناؤ اور بڑائیاں کرنی آپس میں
الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ (سورۃ حدید)	اور بہتات ڈھونڈنی مال کی اور اولاد کی۔

لیکن بچپن کے کھیل کود، نوجوانی کے زیب و زینت اور بناؤ سنگھار، شباب کے فخر و مباہات

اور کہولت کے تکاثرِ اموال و اولاد کے ان ہی ادوار سے گزرتے ہوئے اک ذرا ہوش میں آنے سے حیاتِ دنیوی ایک حقیقتِ کبریٰ اور نعمتِ غیر مترقبہ کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ اور اگر یہ ہو جائے تو بس یہی حاصلِ حیات ہے۔ اگرچہ یہ ایک دردناک حقیقت ہے کہ یہ "ہوش" کسی کسی ہی کو نصیب ہوتا ہے — وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ[1]

ہوش میں آکر اگر حقیقت کی کوئی جھلک دیکھ پاؤ اور پھر اسی کے رخِ زیبا کے پرستار اور اسی کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہو جاؤ تو بس یہی سرمایۂ حیات ہے پھر جب تک یہاں رہو گے چین اور سکون سے رہو گے اور اَحَقُّ بِالْاَمْنِ[2] قرار پاؤ گے، موت حجلۂ عروسی میں داخلے سے زیادہ خوش آئند نظر آئے گی اور اس کا استقبال مسکراتے ہوئے کرو گے ؎

نشانِ مردِ مومن با تو گویم
چوں مرگ آید تبسم بر لبِ اوست (اقبال)

اور وہاں اٹھو گے تو اس حال میں کہ

نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ (سورۃ تحریم) — ان کی روشنی دوڑتی ہے ان کے آگے اور ان کے داہنے۔

اور پھر ابدالآباد تک امن اور سکون ہی میں نہیں رہو گے بلکہ تمہاری مشاہدۂ حق کی لحظہ بلحظہ بڑھتی ہوئی پیاس کو آسودگی عطا کی جائے گی۔ یہاں تک کہ تم "حقیقت الحقائق" اور "جانِ جاناں" کا مشاہدہ کرو گے!

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ (سورۃ قیامہ) — کتنے منہ اس دن تازہ ہیں اپنے رب کی طرف دیکھنے والے۔

اور اگر ہوش میں نہ آئے، زمینی خواہشات[3] ہی میں غلطاں و پیچاں رہے اور

---

[1] اور یہ بات ملتی ہے اسی کو جس کی بڑی قسمت ہو۔ (سورۃ حم سجدۃ) (ترجمہ شیخ الہندؒ)

[2] "فَاَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ" (سورۃ الانعام)
اب دونوں فریقوں میں کون مستحق ہے دلجمعی کا۔ (" ")

[3] وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوَاهُ (سورۃ اعراف)
مگر وہ تو رہا زمین کا اور پیچھے ہو لیا اپنی خواہشوں کے۔ (" ")

اوندھے منہ پڑ کر پستی ہی پر نگاہوں کو جمائے رکھا اور یہاں کی جھوٹی مسرتوں اور آسودگیوں ہی کی تلاش میں سرگرداں رہے تو یہ زندگی تمناؤں اور آرزوؤں کے "بحرِ لجّی" میں دیوانہ وار ہاتھ پاؤں مارتے ہی بیت جائے گی۔ جہاں "ظلماتٌ بعضُھا فوقَ بعضٍ" کے سوا کچھ نہیں۔

اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰىهُ	یا جیسے اندھیرے گہرے دریا میں چڑھی
مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ	آتی ہے اس پر ایک لہر، اس پر ایک
سَحَابٌ ۭ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ	اور لہر اور اس پر بادل، اندھیرے ہیں
بَعْضٍ (سورہ نور)	ایک پر ایک۔

مرد گے اس پیاسے کی موت جو سراب کو پانی سمجھ کر دیوانہ وار دوڑتا رہا۔ حتیٰ کہ انتہائی حسرت و یاس کی حالت میں جان دے دی۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۢ	اور جو لوگ منکر ہیں ان کے کام جیسے ریت
بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَاۗءً ۭ حَتّٰٓى	جنگل میں، پیاسا جانے اس کو پانی یہاں
اِذَا جَاۗءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـــًٔا وَّ	تک کہ جب پہنچا اس پر اس کو کچھ نہ پایا
وَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ	اور اللہ کو پایا اپنے پاس، پھر اس کو پورا
حِسَابَهٗ (سورہ نور)	پہنچا دیا اس کا لکھا۔

اور وہاں اٹھو گے اس حال میں کہ زبان پر "رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى"[2] کا شکوہ ہو گا۔ اور پھر رہو گے ابدالآباد تک اس حال میں کہ نہ زندوں میں ہو گے نہ مردوں میں

ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى (سورہ اعلیٰ)	پھر نہ مرے گا اس میں نہ جیے گا

نہ عذاب کی سختی جینے ہی دے گی اور نہ موت ہی آئے گی کہ اس سے چھٹکارا دلا دے۔

لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا الْمَوْتَ (سورہ دخان)	نہ چکھیں گے وہ اس میں موت۔

---

[1] اَفَمَنْ يَّمْشِيْ مُكِبًّا عَلٰي وَجْهِهٖٓ اَهْدٰٓى اَمَّنْ يَّمْشِيْ سَوِيًّا عَلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (سورہ ملک)
بھلا ایک جو چلے اوندھا اپنے منہ کے بل وہ سیدھی راہ پائے یا جو چلے سیدھا ایک سیدھی راہ پر۔

[2] اے رب کیوں اٹھایا تو نے مجھے اندھا؟ (سورہ طٰہٰ)

دنیا اور آخرت میں تضاد نہیں توافق ہے! غلط سمجھا جنھوں نے انہیں ایک دوسرے سے مختلف سمجھا، یہ دونوں باہم دگر پیوست و ہم آغوش ہیں، ایک ہی حیاتِ انسانی کا تسلسل ان میں جاری ہے۔ جس نے یہاں دیکھا وہی وہاں بھی دیکھے گا۔ جو یہاں "اعمیٰ" رہا وہ وہاں اَعْمٰی ہی نہیں بلکہ اَضَلُّ سَبِیْلًا ہوگا۔

وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ	اور جو کوئی رہا اس جہان میں اندھا سو
فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ	وہ پچھلے جہان میں بھی اندھا ہے اور بہت
سَبِيْلًا (سورہ بنی اسرائیل)	دور پڑا ہوا ہے راہ سے۔

اور حقائق سے جیسے یہاں محجوب رہا ویسے ہی حقیقت کبریٰ کے مشاہدے سے وہاں محروم رہے گا۔

كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ	کوئی نہیں وہ اس دن اپنے رب سے روک
لَّمَحْجُوْبُوْنَ (سورہ مطففین)	دیئے جائیں گے۔

دیکھی اس حیاتِ مستعار کی عظمت! — اور اس "اک ذرا ہوش میں آنے" کی اہمیت۔ تبھی تو وحی الٰہی بار بار پکارتی ہے — "لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ"!

قرآن حکیم بار بار پوچھتا ہے۔

هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ	کب برابر ہو سکتا ہے اندھا اور
(سورۃ الانعام)	دیکھنے والا
هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ	کوئی برابر ہوتے ہیں سمجھ والے اور
لَا يَعْلَمُوْنَ (سورہ زمر)	بے سمجھ۔

حقیقت یہ ہے کہ اصل فرق "علم" اور "جہل" ہی کا تو ہے۔ بالکل صحیح کہا تھا جس نے کہا تھا "علم نیکی ہے اور جہالت بدی" انسانوں کے اس جمِ غفیر پر نگاہ ڈالو جو زمین میں بس رہا ہے اور دیدۂ بینا کو وا کرو — یہ ساری جہل ہی کی تو بساط پھیلی ہوئی ہے! کون سے تعجب کی بات ہے اگر پیدائش سے موت تک کے وقفے ہی کو "زندگی" سمجھنے والے انسان نما حیوانوں کا یہ ہجوم چھوٹی چھوٹی چیزوں پر لڑے اور کٹ مرے، ایک دوسرے پر جھپٹے اور غرائے۔ بالکل ٹھیک دیکھا تھا اس صاحبِ چشمِ حقیقت بین

نے جس نے انسانوں کی بستی میں بجائے انسانوں کے کتّوں، بھیڑیوں اور سوّروں کو چلتے پھرتے دیکھا تھا۔ "اِنْ ھِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا" کے جہلِ مرکب کے بطن سے حرص ولالچ، حسد وبغض، غیظ وغضب، دشمنی وعداوت کے سوا اور کیا جنم پا سکتا ہے؟ یہ چھوٹی مسرتوں اور آسودگیوں کی تلاش میں سرگرداں، حقیر سی آرزوؤں اور تمنّاؤں کے پھندوں میں گرفتار اور طولِ امل کے سراب پر دم توڑتے ہوئے انسان اسی تصورِ حیات کا شاہکار تو ہیں! ــــ ذرا سوچو اس جہل نے "احسن تقویم" میں تخلیق پائے ہوئے انسان کو کیسے اَسْفَلَ سَافِلِین بنا کر رکھ دیا ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ	ہم نے بنایا آدمی خوب سے انداز ے
تَقْوِیْمٍ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ	پر، پھر پھینک دیا اس کو نیچوں سے
سَافِلِیْنَ (سورہ والتین)	نیچے۔

یہ کیسی چھوٹی چھوٹی اور حقیر سی چیزوں کو پاکر خوش ہی نہیں ہوجاتا اترانے لگتا ہے اور اکڑ اکڑ کر چلنا شروع کر دیتا ہے اور کتنی چھوٹی چھوٹی تکالیف اور محرومیوں پر حسرت ویاس کی تصویر بن جاتا ہے۔

وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ	اور جب ہم آرام بھیجیں انسان پر تو ٹال
وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ	جائے اور بچائے پہلو اپنا اور جب پہنچے اس
يَئُوْسًا (سورہ بنی اسرائیل)	کو برائی تو رہ جائے مایوس ہو کر۔

"جہل" کے یہ سارے "شاہکار" تمہاری نگاہوں کے سامنے ہیں اور ان کا مشاہدہ تم بچشمِ سر کر سکتے ہو لیکن "علم" کے "پیکر" کو دیکھنے کے لیے تمہیں اپنی چشمِ تصوّر کو وا کرنا ہوگا۔ ذرا اندازہ تو کرو اس ذہن کی وسعت کا جو حیات کو ابدی جانتا ہو، جو اس حیاتِ دنیوی کو بس ایک سفر کا درجہ دے، جس کی منزل موت کی سرحد سے آگے، بہت آگے ہو ع

پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی!

"کُنْ فِی الدُّنْیَا کَاَنَّكَ غَرِیْبٌ اَوْ عَابِرُ سَبِیْلٍ"[۵] جو یہاں کی چھوٹی مسرتوں اور حقیر سی

---

۵ حدیث نبوی صلعم: رہو دنیا میں ایسے کہ گویا تم اجنبی ہو یا مسافر!

لذتوں پر "مالی وللدنیا!"[1] کی نگاہ غلط انداز ڈالتا ہوا حیاتِ اخروی کی ان معنوی اور حقیقی نعمتوں پر نگاہ جمائے بڑھا چلا جائے۔ "مالا عین رأت ولا اذن سمعت وما خطر علیٰ قلب بشر"[2]

یہی تو ہیں حقیقت کے شناسا، قلب زندہ اور دیدۂ بینا کے مالک، روحِ حیات سے ہم آغوش اور حقیقت کے جمالِ جہاں تاب کے پرستار، یہ جیتے ہیں تو "حق" کا نشان بن کر اور مرتے ہیں تو حقیقت کی نشاندہی کرتے ہوئے۔ ع

جب وقتِ شہادت آتا ہے دل سینوں میں رقصاں ہوتے ہیں!

زندگی میں انہیں "احدی الحسنیین"[3] کے سوا کچھ نظر نہیں آتا اور موت ان کے لیے حیاتِ جاوید کا پیغام بن کر آتی ہے۔ "بل احیاءٌ عند ربھم یرزقون"[4]

یہ ہے کرشمہ اس حقیقت کے علم کا کہ حیاتِ انسانی ابدی ہے! درختوں کو پھلوں سے پہچاننے والو! کوئی اندازہ کر سکتے ہو اس شجرِ حیات کی عظمت کا جس کا تصور ذہن کی اس وسعتِ نگاہ کی اس بلندی اور کردار کی اس پختگی کے برگ و بار لاتا ہے۔ "اَصْلُهَا ثابت وفرعها فی السماء"[5]

اور ابھی یہ تو ایک ہی رخ ہے "عظمتِ حیات" کی تصویر کا دوسرا رخ ابھی باقی ہے۔ ابدیت کے رخ کے "جاننے" والے چاہے کم ہوں، اس کے "ماننے" والے بہت ہیں۔ لیکن تصویر کے اس دوسرے رخ کو تو شاذ ہی کسی نے دیکھا ہے۔

---

[1] حدیث نبوی صلعم: "مالی وللدنیا؟ ما انا فی الدنیا الا کراکب استظل تحت شجرۃ ثم راح وترکھا" مجھے دنیا سے کیا سروکار، دنیا میں میرا حال تو اس سوار سے زیادہ نہیں ہے جو ایک درخت کے سائے میں ذرا دم لے، پھر اسے چھوڑ کر چل دے۔

[2] حدیث نبوی صلعم: جن کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا اور نہ ان کا ادراک کسی انسان کے قلب کو حاصل ہوا۔

[3] قُلْ هَلْ تَرَبَّصُونَ بِنَا إِلَّا إِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ (سورہ توبہ)
تو کہہ دے تم کیا امید کرو گے ہمارے حق میں مگر دو خوبیوں میں سے ایک کی۔ (ترجمہ شیخ الہند)

[4] بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس کھاتے پیتے (سورہ آل عمران) [5] اس کی جڑ مضبوط ہے اور ٹہنے ہیں آسمان میں۔ (سورہ ابراہیم)

وحی الٰہی نے جہاں "حیات بعد الممات" کے حقائق کو اجاگر کیا ہے وہاں "حیات قبل الولادت" کی حقیقت کو بھی بالکل مخفی نہیں رکھا۔ اگرچہ یہ واقعہ ہے کہ اس کا اظہار "بطرز خفی" کیا ہے! لیکن اس کا سبب بالکل معقول اور بادنیٰ تامل معلوم ہو جانے والا ہے۔ کتاب الٰہی "ھدی للناس"[1] ہے اور اس نے انسانوں کے مختلف طبقات اور گروہوں کی ضرورت کو گہری حکمت کے ساتھ پیش نظر رکھا ہے۔ "حیات بعد الممات" کا علم انسانوں کی ایک عظیم اکثریت کی "حیات دنیوی" کی عملی اصلاح کے لیے ناگزیر تھا۔ لہذا اس کے حقائق انتہائی جلی انداز میں روز روشن کی طرح کتاب کے ہر ورق پر نمایاں کر دیئے گئے جبکہ حیات قبل الولادت، کا علم صرف علم کی گہری پیاس رکھنے والے ذہنوں کی آسودگی کے لیے ضروری ہے۔ اور ظاہر ہے کہ "ذہن رسا" کے لیے "حقیقت خفی" کا ادراک کیا مشکل ہے!

یہی وجہ ہے کہ تصویر حیات کے اس رُخ کی بس کوئی جھلک ہی کہیں کہیں دکھا دی گئی ہے!

وحی الٰہی نے حیات دنیوی سے قبل کی ہماری کیفیت کو "اَمْوَاتًا" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ کیسا صاحب عظمت اور کتنا حامل حکمت کلام ہے۔

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ	کس طرح کافر ہوتے ہو اللہ تعالیٰ سے
اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ	حالانکہ تم بے جان تھے پھر جلایا تم کو، پھر
ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ	مارے گا تم کو، پھر جلائے گا تم کو، پھر اسی
تُرْجَعُوْنَ (سورۃ بقرہ)	کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

"اَمْوَاتًا" کے لفظ کی تفسیر جس کسی نے نُطَفًا فی الاصلاب[2] کے الفاظ بڑھا کر کی اس نے تو خیر پھر بھی کم از کم ایک خالص حیاتیاتی حقیقت کی طرف تو اشارہ کر دیا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ جس نے اسے "معدوم" کے ہم معنی قرار دیا اس نے وحی الٰہی پر طبع آزمائی کرنے کی جرأت کی ہے۔

ذرا غور کریں، حیات انسانی کا یہ دور جسے ہم "حیات دنیوی" کہتے ہیں، دو موتوں کے درمیان واقع ہوا ہے، ایک اس سے پہلے اور دوسری اس کے بعد۔ تو ہے کوئی جو بعد والی موت کو عدم سے

---

[1] ہدایت ہے واسطے لوگوں کے (سورہ بقرہ)

[2] آباؤ اجداد کی پیٹھوں میں بشکل نطفہ (تفسیر جلالین)

تعبیر کرے؟ پھر کیسا ستم ہے کہ پہلی موت کو عدم کہنے والے چاہے کم ہوں سمجھنے والے اکثر و بیشتر ہیں! واقعہ یہ ہے کہ نہ وہ موت معدوم ہونے کا نام ہے نہ یہ کیفیتِ عدم کا اظہار، نہ اس پر زندگی ختم ہو گی نہ اس سے اس کی ابتدا ہوئی ۔ بلکہ جیسے بعد والی موت بجائے خود زندگی ہی کا ایک وقفہ ہو گی ، اسی طرح قبل والی موت بھی زندگی ہی کا ایک دور تھی۔

اور جس طرح آنے والی موت کے بعد حیاتِ اخروی کو شروع ہونا ہے بالکل اسی طرح گزشتہ موت سے قبل بھی ایک زندگی تھی جس کا سب سے بڑا واقعہ وہ عہدِ الست ہے جس کی خبر وحیِ الٰہی نے دی اور جس کی یاد فطرتِ انسانی کی گہرائیوں میں محفوظ ہے۔

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْ اٰدَمَ مِنْ	اور جب نکالا تیرے رب نے بنی آدم کی
ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ	پیٹھوں سے ان کی اولاد کو اور اقرار کرایا ان سے
عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا	ان کی جانوں پر ، کیا میں نہیں تمہارا رب؟ بولے
بَلٰى شَهِدْنَا ۔ (سورہ اعراف)	ہاں ہے ہم اقرار کرتے ہیں ۔

تو کون کہہ سکتا ہے کہ جب یہ میثاق لیا گیا اس وقت عہد کرنے والوں کو اپنی ہستی کا شعور نہ تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو کیا اس عہد و میثاق کی کوئی حیثیت اور اہمیت ہو سکتی تھی جو کلامِ الٰہی کے سلسلۂ استدلال کی ایک اہم کڑی ہے! یقیناً وہاں ہر انسان نے اپنی ہستی اور تشخص کے شعور کے ساتھ عہد باندھا تھا۔ تو پھر "حیات" کیا کسی اور چیز کا نام ہے؟

اس حیاتِ اولین کے اثبات پر قرآن حکیم کی وہ آیۂ کریمہ دلیلِ قطعی ہے جس میں اہلِ جہنم کی فریاد ان الفاظ میں نقل کی گئی ہے کہ

رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا	اے رب ہمارے تو موت دے چکا ہم کو دوبار
اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا	اور زندگی دے چکا ہم کو دوبار ، اب ہم قائل
فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ	ہوئے اپنے گناہوں کے ، پھر اب بھی ہے
سَبِيْلٍ (سورۃ غافر)	نکلنے کو کوئی راہ ۔

ذرا "وجود" اور "ہستی" کے اس تسلسل پر غور کرو ۔ جو اس آیۂ مبارکہ کے جامِ حقیقت نما سے چھلکا پڑ رہا ہے!

؎ نغمے بیتاب ہیں تاروں سے نکلنے کے لیے
اِک ذرا چھیڑ تو دے زخمۂ مضرابِ حیات

ہم اپنے شعورِ حیات کے ساتھ موجود تھے، پھر ہم پر "اماتۃ اولیٰ" کا عمل ہوا۔ اور ہم ایک طویل عرصے کے لیے "پہلی موت" کی گود میں سو گئے، پھر "احیائے اولیٰ" ہوا اور ہم حیاتِ دنیوی کی "بساط ہوائے دل" پر "وارد" ہو گئے۔ پھر "اماتۃ ثانیہ" ہو گی اور ہم پھر اک بار موت کی نیند سو جائیں گے اور پھر "احیاءِ ثانی" کا صور پھونکا جائے گا اور ہم "زندہ جاوید" ہو جائیں گے!!

ذرا ٹھہرو!

حیات کی عظمت کے ساتھ ساتھ موت کی حقیقت بھی دیکھ لو۔ یہ زندگی کا ایک "وقفہ" ہی نہیں، سلسلہ حیات کی ایک کڑی اور زندگی ہی کی ایک شکل ہے۔ بالکل نیند سے مشابہ،

اب ذرا تلاوت کرو آیۂ کریمہ۔

اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِھَا وَالَّتِیْ	اللہ کھینچ لیتا ہے جانیں جب وقت ہو ان کے مرنے کا
لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِھَا (سورہ زمر)	اور جو نہیں مریں، ان کو کھینچ لیتا ہے ان کی نیندیں۔

اور گوشِ حقیقت نیوش سے سنو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ

وَاللّٰہِ لَتَمُوْتُنَّ کَمَا تَنَامُوْنَ ثُمَّ	خدا کی قسم تم لازماً مر جاؤ گے جیسے تم سو جاتے ہو
لَتُبْعَثُنَّ کَمَا تَسْتَیْقِظُوْنَ	پھر یقیناً اٹھا لیے جاؤ گے جیسے تم نیند سے
(حدیث)	بیدار ہوتے ہو۔

اور یاد کرو آپؐ کی وہ دعا جو آپؐ کی ہر صبح کا معمول تھی:۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَحْیَانِیْ بَعْدَ	تعریف ہے اللہ کی جس نے مجھے زندگی عطا
مَا اَمَاتَنِیْ وَاِلَیْہِ النُّشُوْر	فرمائی، اس کے بعد کہ مجھ پر موت طاری
(حدیث)	فرما دی تھی۔

شاید حقیقت کی کوئی جھلک دیکھ لو!

اللہ اکبر! کیا "ظلماتٌ بعضھا فوق بعض" کا گھپ اندھیرا طاری ہے ان ذہنوں پر جو موت اور زندگی کو عدم اور وجود کے ہم معنی سمجھ بیٹھے ہیں!

حقائق کے اس طرح درجہ بدرجہ اور "طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ" انکشاف کے بعد اب ذرا محسوسات

(بقیہ صفحہ ۵۶)

ڈاکٹر اسرار احمد کی تالیف

"تحریکِ جماعتِ اسلامی"

پر روزنامہ "وفاق" لاہور کا تبصرہ

" زیرِ نظر کتاب جماعت اسلامی کے اپنے ہی بیان کردہ اصولوں اور نظریات سے انحراف کی ایک دلخراش مگر مستند اور مدلل داستان ہے جسے جماعت اسلامی کے لٹریچر کا تحقیقی مطالعہ اور جماعت اسلامی کی سرگرمیوں کا قریبی جائزہ لینے کے بعد اس جماعت ہی کے ایک ممتاز اور ذہین کارکن ڈاکٹر اسرار احمد نے مرتب کیا ہے اور دو اور دو چار کی طرح یہ المناک حقیقت واضح کر دی ہے کہ جماعت اسلامی کی موجودہ سرگرمیاں ان بنیادی نظریات اور اساسی تصورات سے کوئی تعلق نہیں رکھتیں جن پر اس جماعت نے ایک ہمہ گیر اسلامی تحریک کا بیڑا اٹھایا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کی یہ تالیف دراصل ان کے ایک بیان پر مشتمل ہے جو موصوف نے ۱۹۵۶ء میں اس وقت مرتب کیا تھا جب جماعت کے عمومی حالات کا جائزہ لینے اور ارکان جماعت سے فرداً فرداً رابطہ قائم کر کے ان کی بے چینی کے اسباب معلوم کرنے کے لیے مجلس شوریٰ کے چار اہم اور بزرگ ارکان پر مشتمل جائزہ کمیٹی پورے ملک کا دورہ کر رہی تھی۔ یہ بیان مرتب کرتے وقت انہیں ہرگز یہ احساس نہیں ہوگا کہ بیان کسی مرحلہ پر ان کے اور ان کی طرز پر سوچنے والے متعدد دوسرے متعلقین جماعت کے "قصہ درد" کی شکل اختیار کر کے منظر عام پر آئے گا۔ یہ بیان تو محض اس جائزہ کمیٹی کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا جسے اپنی رپورٹ جماعت اسلامی کی مرکزی مجلس شوریٰ کے سامنے پیش کرنا تھی جسے اس رپورٹ کی روشنی میں اصلاحِ احوال کے لیے ضروری اقدامات کرنے تھے لیکن افسوس کہ جس گتھی کو سلجھانے کے لیے یہ جائزہ کمیٹی معرضِ وجود میں آئی تھی اس نے بالآخر جماعت اسلامی ہی کو ایک معمہ بنا کر رکھ دیا۔ اور جائزہ کمیٹی کے جو ارکان مسلسل کئی ماہ حالات کا جائزہ لینے اور اس جائزے پر مبنی رپورٹ تیار کرنے میں مصروف رہے وہ بدقسمتی سے اس رپورٹ ہی کی بھینٹ چڑھ گئے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ مجلس شوریٰ کے ان بزرگ ارکان کی گرم آنسوؤں سے تر سفید داڑھیاں آج بھی مولانا مودودی کی اس نادیدنی

کارروائی پر نوحہ کناں ہیں جو مولانا مودودی کے آمرانہ مزاج کا بدترین مظہر ثابت ہوئی اور جس کے تحت مولانا مودودی نے اپنے ان مخلص، متقی اور معمر ساتھیوں کو "نادانستہ سازش" کے الزام میں شوریٰ کی رکنیت سے علیحدگی کے نوٹس دے دیئے تھے۔ مولانا مودودی کو کہاں اندازہ ہوگا کہ آج بھی جبکہ اس المیہ کو دس سال بیت چکے ہیں کتنے ہی سینوں سے سرد آہ کے ساتھ یہ صدا بلند ہوتی رہتی ہے کہ کاش مولانا مودودی اپنے اہم ترین رفیقوں سے محض کسی شیطانی وسوسہ کی بنا پر اس درجہ بدگمان نہ ہو گئے ہوتے کہ ان کی رفاقت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم ہو جاتے۔

یہ چار بزرگ کون ہیں جماعت اسلامی کا ذکر ان بزرگوں کے نام کے بغیر بالکل ادھورا رہتا ہے۔ ان میں مولانا عبدالغفار حسن ہیں جن کا کردار تدین و تقویٰ اور علم و فضل کی دولت بے بہا سے مزین ہے۔ مولانا عبدالجبار غازی ہیں جو بڑھاپے میں بھی جوانوں کی سی گرمجوشی اور ان تھک محنت سے کام لے کر جماعت کے تعلیمی نظام کی بنیادیں استوار کرنے میں مصروف رہے۔ شیخ سلطان احمد ہیں جو اخلاص، جذبۂ انفاق اور تدبر و حکمت میں بے مثل کردار کے حامل ہیں۔ یہ تینوں حضرات وقتاً فوقتاً مولانا مودودی کے قائمقام کی حیثیت سے کل پاکستان جماعت اسلامی کی امارت کے منصب پر فائز رہ چکے ہیں اور چوتھے مولانا عبدالرحیم اشرف ہیں جو دینی غیرت و حمیت، جوش و ولولہ اور عزم و ہمت میں اپنی مثال آپ ہیں۔

یہ ہیں وہ چار اصحاب جن پر "سازش" کا شبہ کیا گیا حالانکہ سچی بات یہ ہے کہ اس دور میں اسلام کے خلاف سب سے خطرناک سازش کا ارتکاب خود مولانا مودودی سے ہوا جنہیں اس کا شعور شاید اب تک نہیں ہو پایا اور اس میں ان کی نیت بھی زیر بحث نہیں ہے لیکن امر واقعہ یہی ہے کہ دین کے نام پر اٹھنے والی عظیم الشان تحریک اسلامی کو بے اصول اور بے دینی کی علمبردار تنظیموں کی آغوش میں لے جانے اور اس کی ناؤ کو باطل سیاست کی بے رحم موجوں کے حوالے کر دینے میں مولانا مودودی کی غلط اندیشی کو گہرا دخل ہے۔ دورِ اول میں دین کی خدمت بھی اگرچہ مولانا مودودی نے بہت زیادہ کی ہے لیکن اب تو الٹا ہی چکر چل رہا ہے خدا خیر کرے۔

ان چاروں اصحاب میں سے تین بزرگوں نے تو آپ بیتی کو آج تک سینے کا داغ بنائے رکھنا ہی بہتر سمجھا ہے البتہ چوتھے صاحب کبھی کبھار ؎

قصۂ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم

کے مصداق قلم کو حرکت میں لاتے رہتے ہیں مگر سچی بات یہ ہے کہ اس موضوع پر جس شرح و بسط کے ساتھ

ایک منضبط اور مفصل تحریر سامنے آنی چاہیئے تھی وہ ابھی تک نہ آسکی تھی۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے اس کمی کو پورا کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے اور ان کی اس کاوش کا یہ پہلو حد درجہ لائق تحسین ہے کہ اس کتاب کی ایک ایک سطر سے مؤلف کی دل سوزی اور دردمندی جھلک رہی ہے۔

جماعت اسلامی میں بدگمانی کے جس دور کی ابتدا مولانا مودودی کی اس تادیبی کارروائی سے ہوئی جس کا ذکر سطور بالا میں کر چکا ہوں اس دور میں جماعت اسلامی بہت سے اہل علم اور اہل قلم کے تعاون سے محروم ہوگئی۔ مؤلف کتاب بھی انہی اصحاب میں شامل ہیں ؎

کوئی کارواں سے ٹوٹا کوئی بدگماں حرم سے کہ امیر کارواں میں نہیں خوئے دلنوازی

میری یہ دیانتدارانہ رائے ہے کہ اگر جماعت اسلامی کے متعلقین تعصب سے کام لیے بغیر اس کتاب کے آئینے میں اپنی موجودہ سرگرمیوں کا جائزہ لینا چاہیں تو انہیں ہر وہ داغ اور دھبہ صاف دکھائی دے سکتا ہے جو تحریک اسلامی کے شفاف چہرے کو مسخ کرنے کا موجب بن چکا ہے اور بعید نہیں کہ ان کے اندر کا وہ انسان پھر سے جاگ اٹھے جو دین حق کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے میدان عمل میں کودا تھا۔ لیکن اب نادانستہ طور پر ہی سہی باطل کے پجاریوں کا شریک وسہیم بن چکا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنی اس کتاب میں کمال محنت اور عرق ریزی سے کام لے کر جماعت اسلامی کے دور اول کے ہر اہم اصول اور دعویٰ کو دور ثانی کے اقوال و اعمال کی کسوٹی پر پرکھا ہے اور یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ جماعت اسلامی کلی طور پر اپنے موقف سے دستبردار اور ایک تکلیف دہ تضاد کا شکار ہو چکی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ جماعت اسلامی کے "رنگ جدید" اور "نقوش تازہ" پر بحث کرنے کے بعد جماعت کی پالیسی اور طریق کار میں تبدیلی کے اسباب کا جائزہ بھی لیا ہے۔ اس ضمن میں پہلے تو ان مبینہ وجوہات کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ جو تبدیلی کے جواز میں مولانا مودودی نے پیش کی ہیں اور اس کے بعد اپنا نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ کتاب کا یہ حصہ میرے نزدیک اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اگر یہ بحث شامل نہ ہوتی تو قاری ایک ذہنی الجھن میں مبتلا ہو کر رہ جاتا۔ مؤلف نے تبدیلی کا اصل سبب "عجلت پسندی" کو قرار دیا ہے اور عجلت پسندی کی اس روش کو بھی کوئی الزام قرار دینے کے بجائے فطرت انسانی کا خاصہ ثابت کیا ہے۔ گویا مؤلف کے نزدیک اس تبدیلی میں قیادت کی حرص یا کسی قسم کے فساد نیت کو ہرگز دخل نہیں ہے بلکہ حصول مقصد میں جلد بازی کے باعث موجودہ طرز عمل اختیار کیا گیا ہے جس کا علاج یہ تجویز کیا گیا ہے کہ مومنانہ شان کا مظاہرہ کرتے ہوئے سابق غلطیوں پر اظہار ندامت کر کے ان غلطیوں سے توبہ اور آئندہ کے لیے اصلاح احوال کا مخلصانہ جد وجہد کی جائے۔

جیساکہ اوپر عرض کیا گیا ہے ڈاکٹر صاحب کی یہ کتاب دس سال پرانی ایک تحریر پر مشتمل ہے اور زیادہ تر نظریاتی بحث تک ہی محدود ہے۔ موصوف سے یہ گزارش بے جا نہ ہوگی کہ جماعت اسلامی مختلف منزلیں طے کرنے کے بعد دس سال کی مدت میں جس مقام پر پہنچ چکی ہے۔ یہ مقام ایک دوسری کتاب کا تقاضا کرتا ہے جس میں حقائق و واقعات کی روشنی میں یہ ثابت کرنے کی ضرورت ہے کہ جماعت اسلامی ایسی عظیم دینی جماعت اب تحریک اسلامی کی علمبردار نہیں ہے بلکہ بدقسمتی سے عملاً "تحریکِ حکمت عملی" کی علمبردار بن چکی ہے اور عوامی ذہنوں کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کی جدوجہد کرنے کے بجائے اب اس جماعت نے اسلامی اقدار کو عوامی سانچوں میں ڈھالنے کی مہم شروع کر رکھی ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب کی کتابت و طباعت ہر لحاظ سے معیاری ہے بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ ظاہری نفاست کے اعتبار سے ناشر نے جماعت اسلامی کے ذوق کو پوری طرح ملحوظ رکھا ہے۔ اپیل یا درخواست تو شاید کارگر نہ ہو اس لیے میں دعا کرتا ہوں کہ جماعت اسلامی کے زعما اور کارکنوں کو اس کتاب کے مطالعے کی توفیق نصیب ہو۔ ممکن ہے ان کی بگڑی بنانے میں یہ کتاب نسخہ کیمیا اثر ثابت ہو اور اس میں کم از کم مجھے کوئی شبہ نہیں کہ ان کی بگڑی بننے سے پوری ملتِ اسلامیہ کا مفاد وابستہ ہے۔" (تحریر مصطفیٰ صادق)

(بقیہ افادات فراہیؒ)

اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ	کی شفاعت نہ کر سکیں گے سوائے اس کے جس
مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ	سے خدا راضی ہو اور وہ اس کی خشیت سے
(انبیاء ۲۷ ، ۲۸)	خوف زدہ ہوں گے۔

بلا اذن شفاعت کا عقیدہ کئی اعتبارات سے غلط ہے

اول، ایسی شفاعت سوءِ ادب میں داخل ہے۔ اسی لئے فرمایا کہ "وہ تو خدا کی خشیت سے خوف زدہ ہوں گے"۔ وہ کب شفاعت کی جرأت کریں گے۔

دوم، یہ شفاعت خدا کے خوف کے منافی ہے۔ ایک مجرم کا سارا بھروسہ شفعاء پر ہوتا ہے اور اس کی نظروں میں عدل کے تقاضوں اور جزا و سزا کا کوئی وزن نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ اللہ سے نہیں ڈرتا، جیساکہ فرمایا۔

وَاَنْذِرْ بِهِ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ	اس قرآن سے ان لوگوں کو تنبیہ کرو جو اس بات

اَنْ یُّحْشَرُوْٓا اِلٰی رَبِّهِمْ لَیْسَ	سے ڈرتے ہیں کہ اپنے رب کے پاس جمع کئے
لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِیٌّ وَّلَا شَفِیْعٌ	جائیں جہاں خدا کے سوا نہ ان کا کوئی حمایتی ہوگا اور
لَعَلَّهُمْ یَتَّقُوْنَ (انعام-۵۱)	نہ شفاعت کرنے والا، تاکہ وہ ڈریں۔

سوم۔ شفاعت کا یہ عقیدہ شرک پیدا کرتا ہے۔ یہ عقیدہ رکھنے والے شفعاء کو پوجتے ہیں، خدا کی نسبت ان سے زیادہ محبت رکھتے ہیں بلکہ خدا سے اس طرح کا خوف کھاتے ہیں جیسا ایک غضبناک سخت گیر انسان سے خوف کھایا جاتا ہے اور شفعاء کے دامن میں پناہ لیتے ہیں، حالانکہ صحابہ کرامؓ کا یہ حال تھا کہ اللہ پر بھروسہ رکھتے تھے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کو جو امیدیں تھیں، ان سے کہیں زیادہ امیدیں اللہ تعالیٰ سے وابستہ کیے رہتے تھے۔ انبیاء کی شفاعت کا جو طریقہ قرآن نے بیان کیا ہے وہ بھی کیا ہی خوب ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کی جو شفاعت کریں گے اس کے الفاظ یوں بتائے گئے ہیں۔

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ	اگر تو ان کو عذاب دے تو یہ تیرے بندے ہیں
وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ	اور اگر انہیں بخشے تو تو غالب اور حکمت والا
الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ (مائدہ-۱۱۸)	ہے۔

یعنی عذاب کے بیان میں ان کا معاملہ پروردگار کی طرف پھیر دیا اور ان کی مغفرت کی شفاعت سے اپنے آپ کو خارج کر لیا، لیکن اس کے ساتھ ہی خدا کی قدرت و حکمت کے کمال کا اعتراف بھی کیا۔ گویا یہ کہا کہ اگر تو ان کو بخش دے تو یہ خالص تیرے حکم کا نتیجہ ہوگا اور کسی کی یہ حیثیت نہیں کہ تجھے روک دے یا تیری مخالفت کرے یا کسی بہتر چیز کی طرف تیری رہنمائی کرے۔

چہارم۔ یہ شفاعت جس طرح خدا کے شرک کے باب سے ہے، اسی طرح یہ اس کے علم اور قدرت کا انکار بھی ہے، جیسا کہ فرمایا۔

مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا	کون ہے جو اس کے اذن کے بغیر اس کے
بِاِذْنِهٖ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ	پاس شفاعت کرے، وہ تو جانتا ہے جو
وَمَا خَلْفَهُمْ (بقرہ-۲۵۵)	کچھ ان کے آگے اور پیچھے ہے۔

(بقیہ تفسیر)

کو اللہ کے بجائے اپنا بندہ بننے کی دعوت دے۔ مطلب یہ ہے کہ تمہاری بدعات نہ صرف مسیحؑ کی تعلیمات، تمہاری مسلّمہ تاریخ، اور انبیاء کے متفق علیہ عقائد کے بالکل خلاف ہیں بلکہ عقلِ سلیم بھی مسیحؑ کی طرف ان کی نسبت قبول نہیں کر سکتی۔ اللہ تعالیٰ جب کسی بندے کو نبوت و رسالت کے منصب پر سرفراز فرماتا ہے اور اس کو کتاب و حکمت عطا فرماتا ہے تو اس لیے کہ وہ لوگوں کو دوسروں کی بندگی اور غلامی سے چھڑا کر خدا کی بندگی و غلامی میں لائے نہ کہ ان کو خدا سے چھڑا کر اپنا بندہ بنانے کی کوشش کرے۔ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ جس کو خدا نے اپنے گلّے کی تلاش کے لیے بھیجا وہ خود اس کے گلّے کو بھٹکانے والا بن گیا۔ بھلا اس سے بڑی تہمت خدا کے ایک رسول پر اور کیا ہو سکتی ہے؟

اس کے بعد بتایا کہ ایک حاملِ کتاب و حکمت نبی اگر تمہیں دعوت دے سکتا ہے تو اس بات کی دے سکتا ہے کہ لوگو، خدا پرست اور اللہ والے بنو اس لئے کہ تمہارے کتابِ الٰہی کے پڑھنے پڑھانے والے ہونے کا اگر کوئی صحیح تقاضا ہو سکتا ہے تو یہی ہو سکتا ہے۔

پھر فرمایا کہ جس طرح وہ لوگوں کو اپنا بندہ بننے کی دعوت نہیں دے سکتا اسی طرح وہ یہ دعوت بھی نہیں دے سکتا کہ فرشتوں اور نبیوں کو اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ بنا لو اس لیے کہ دعوتِ ایمان کے ساتھ یہ کفر کی دعوت کس طرح جمع ہو سکتی ہے؟ کیا جو شخص تمہارے لیے ایمان و اسلام کی دعوت لے کر آئے گا وہی تمہیں مسلم بنانے کے بعد کفر میں جھونکنے کی کوشش کرے گا۔

اس آخری ٹکڑے میں خطاب میں ذرا وسعت پیدا ہو گئی ہے یعنی نصاریٰ کے ساتھ ساتھ اس میں ایک اشارہ قریش کی طرف بھی ہو گیا ہے جو فرشتوں اور نبیوں کے بھی بت بنا کر پوجنے لگے تھے۔

(بقیہ حقیقت زندگی)

کی دنیا سے لب بہ بند، چشم بند و گوش بند ہو کر وجدان کی لامتناہی فضا میں چشمِ تخیل کو وا کر دو اور "تسلسلِ حیاتِ انسانی" کا مشاہدہ کرنے کی کوشش کرو۔ اگر کر پائے تو ایک عجیب سا کیف محسوس کرو گے اور سرور و مستی سے ہم کنار ہو گے اور کیا عجب کہ تمہارے منہ سے نکل جائے سُبْحَانِیْ مَا اَعْظَمَ شَانِیْ[1] تو یہی حقیقت کا ادراک ہے۔ ع

لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا!!

---

[1] حضرت بایزید بسطامیؒ کا مشہور قول

غزل

آتشِ عشق کو صد برق و شرر ہونے دو
سارے عالم کو مرے غم کی خبر ہونے دو

عشق میں ہوتا ہے ویراں مرا گھر ، ہونے دو
اک تماشا ہی سہی اہلِ نظر ، ہونے دو

کوئی عنوان تو ملتا ہے مری چاہت کو
خون ہوتے ہیں اگر قلب و جگر ہونے دو

ذرہ ذرہ ہو منوّر مرے ویرانے کا
چاک اس طرح گریبان سحر ہونے دو

اس کے ہاتھوں بھی کوئی جشن بہاراں ہو جائے
دل وحشی کو نہ یوں شہر بدر ہونے دو

شور اٹھتا رہے قائم رہے فریاد کی لے
گریہ ہوتا ہے جو محروم اثر ہونے دو

آج کی رات بھی جلتی رہے دل کی مشعل
آج کی رات بھی آنکھوں میں بسر ہونے دو

مشکور حسین یاد

Regd. No. L. 7360

Monthly "MEESAQ" Lahore

Vol. 12	JULY · 1966	No. 1

جماعتِ اسلامی

- کن مقاصد کے تحت قائم ہوئی تھی؟
- آزادی سے قبل اس کے نظریات کیا تھے؟
- قیامِ پاکستان کے بعد اس نے کیا طرزِ عمل اختیار کیا؟ اور
- اس کے کیا نتائج برآمد ہوئے؟

جماعت کے ماضی و حال کا ایک تاریخی تجزیہ جماعت کے سابق کارکن کے قلم سے

تحریکِ جماعتِ اسلامی

ایک تحقیقی مطالعہ

تالیف

ڈاکٹر اسرار احمد ایم اے ایم بی بی ایس

سابق ناظم اعلیٰ اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان و امیر جماعت اسلامی منٹگمری

● ضخامت = ۲۳۶ صفحات ● سائز بڑا ● طباعت آفسٹ ● مجلد مع گردپوش

● قیمت = ۴ روپے علاوہ محصول ڈاک

دار الاشاعت الاسلامیہ

بالمقابل ۲، ڈاکخانہ کرشن نگر، لاہور

سرورق مکتبۂ جدید پریس میں چھپا